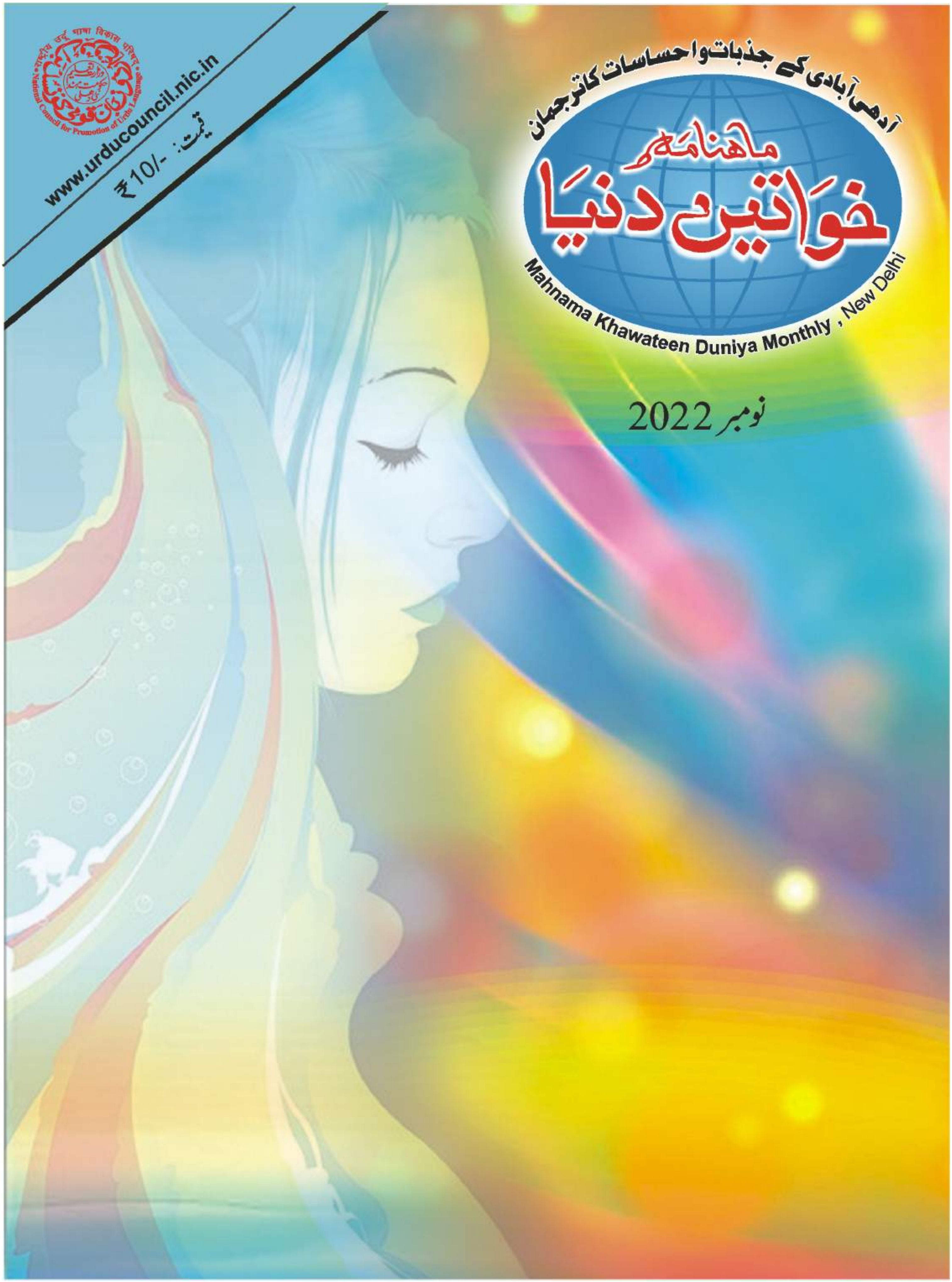

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2022

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

دلچسپ کہانیاں

سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین

صحتِ اطفال

بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

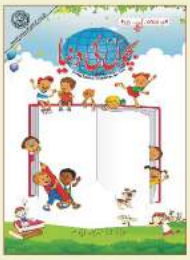

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	صالحہ عابد حسین	محمد عامر	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		9
جہان نسواں	سلطان اختر کی تحسینی رباعیاں	شبانہ عشرت	10
	تنویر احمد علوی بحیثیت محقق و مدون	سفینہ	13
	اقبال سہیل کی مثنوی نگاری	صدف پرویز	18
	طنز و مزاح نگار خواتین	ڈاکٹر شازیہ اشرف	23
	محسن بھوپالی: ''حیرتوں کی سرزمین''	ڈاکٹر عرشی سلطان	28
	ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کا تنقیدی جائزہ	شبیر احمد ڈار	31
مسائل نسواں	خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم کا نظم	پروفیسر مشتاق احمد آئی پٹیل	35
اعتراف ہنر	رخسانہ جبین کی شاعری میں نسوانی مسائل کی عکاسی	محمد وقار صدیقی	40
حسن سخن	شیبا کوثر، رخشاں ہاشمی		44
افسانہ	دیوی	سلمیٰ صنم	46
	وفا کی تلاش	نزہت نبیلہ	49
باورچی خانہ			54
صحت			56
آرائش و زیبائش			60
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		62

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 6 شمارہ: 11 نومبر 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

تاریخ کے اوراق میں ایسے بہت سے نام محفوظ ہیں جنھیں رہتی دنیا تک بھلایا نہیں جا سکے گا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کا زمانہ ہمیشہ معترف رہے گا۔ کچھ شخصیات اپنے کاموں سے ہمیشہ لوگوں کے ذہن و دل میں اپنا مقام بنائے رکھتی ہیں۔ زمانے کی تیز رفتاری بھی ان کے نقوش دھندلے نہیں کر پاتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد [پ: 1888، و: 1958] بھی ایسی ہی شخصیت ہیں جن کو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان کا وژن اور مشن، قوم کے تئیں ان کا درد، ان کی بے لوثی ان کو اعلیٰ مقام پر فائز کرتے تھے۔ حکومت ہند کے پہلے وزیر تعلیم ہونے کا ان کو شرف حاصل تھا۔

انھوں نے ہمیشہ مثبت فکر اختیار کی۔ ان کا ایک مقصد حیات تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ زندگی کے ہر لمحہ کو اپنے مقصد کی تکمیل اور جستجوئے کامل میں لگانا چاہیے۔ ہمیشہ نئی فکر اور نئے عزائم کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی زندگی بہت سے اہم مقاصد سے عبارت ہے۔ وہ ایک عظیم دانشور اور مفکر تھے مگر بطور صحافی، اور بطور سیاسی قائد بہت فعال رہے۔ تعلیم اور خاص کر خواتین کی تعلیم اور ملک کے لوگوں کو متحد کرنے پر انھوں نے بہت زور دیا۔ تعلیم بالغاں، خواتین کی تعلیم اور پسماندہ طبقات کی ترقی کو انھوں نے اپنے مقاصد میں شامل رکھا اور ان مقاصد کی تکمیل میں ان کی شریک حیات زلیخا بیگم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کو فعال رکھنے میں ہمیشہ مثبت رول ادا کیا۔ جب مولانا جیل میں تھے تب بھی وہ ان سے ملنے جیل میں جاتی تھیں۔ زلیخا بیگم نے ان کے حوصلے کو کبھی بھی پست نہیں ہونے دیا۔ ان کے مقاصد ان کے لیے بہت اہم تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تمام زندگی مسلسل جدوجہد میں صرف کی اور اپنی ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

زلیخا بیگم کو ہم کسی بھی طور فراموش نہیں کر سکتے۔ جب مولانا جیل میں تھے اس دوران وہ شدید طور پر بیمار ہوئیں مگر مولانا آزاد کو اپنے بیمار ہونے کی اطلاع تک نہ دی اور دق جیسی بیماری سے لڑتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حوصلے کی بنیاد زلیخا بیگم جیسی صابر وشاکر عورت ہی بنیں۔ جنگ آزادی کے اس مجاہد کو اگر زلیخا بیگم جیسی شریک حیات کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ جنگ آزادی میں جام شہادت نوش کرنے والے مرد مجاہدوں کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں ان خواتین کا رول اہم رہا ہے، جن کو آج ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ ایسی خواتین کو ہمیں اپنے ذہن میں زندہ رکھنے اور عوام الناس کو ان کے کارناموں اور خدمات سے روشناس کرانے کی بھی ضرورت ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

محمد عامر

صالحہ عابد حسین

اردو ادب میں صالحہ عابد حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ مصداق فاطمہ (صالحہ عابد حسین) نے اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی اور ایک ادیبہ کی حیثیت سے معروف ہوئیں۔ صالحہ عابد حسین ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جن میں کئی اہم نام آج بھی ہندو پاک میں خاصی مقبولیت کے حامل ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی بھی ان کے آباؤ اجداد میں سے تھے۔ تعلیم یافتہ خاندان ہونے کے باعث ان کے یہاں عورتیں بھی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہوئی تھیں۔ کچھ ایسا ہی حال صالحہ عابد حسین کا بھی تھا۔ بچپن سے مطالعے کا شوق اور پڑھنے کی لگن نے انھیں اردو کی ادیبہ بنا دیا۔ چوں کہ ہمارے سماج میں عورتوں کی زندگی مختلف مراحل سے گزرتی ہے، جیسے ازدواجی زندگی اور بچوں کی پرورش وغیرہ، لیکن مصداق فاطمہ شادی کے بعد صالحہ عابد حسین بن گئیں۔ ان کی شادی مشہور و معروف ادیب اور علم دوست انسان ڈاکٹر عابد حسین سے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایک علم دوست انسان کی شادی اگر ایک علم دوست انسان سے ہوجائے تو اس کے علم میں نکھار اور قلم میں روانی کا پیدا ہونا فطری بات ہے۔ عابد حسین اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں منفرد عہدوں پر فائز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ہندستان کے مختلف شہروں میں رہنے کا موقع دستیاب ہوا۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ان کی رفیقۂ حیات کا ہونا بھی لازمی تھا، لیکن صالحہ عابد حسین مختلف شہروں میں صرف ایک عام عورت کی طرح نہیں رہیں، چوں کہ عورتوں کو گھریلو زندگی سے زیادہ سروکار ہوتا ہے مگر مصداق فاطمہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ بچپن سے مطالعے کے شوق نے انھیں بہت ساری معلومات سے بہرہ ور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے بعد ان کا جس شہر میں بھی رہنا ہوا اس کو انھوں نے ایک سیاح کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے تمام تر تجربات و مشاہدات کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔ مسلسل صحت کی خرابی نے کسی ایک سفر کی مکمل روداد بیان کرنے نہیں دیا۔ صالحہ عابد حسین نے عمر کے آخری مرحلے میں اپنے حافظے پر زور دے کر ماضی کی بھولی بسری یادوں کو دوبارہ زندہ کیا اور صرف ان ہی واقعات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی جس سے کہ ایک روداد سفر وجود میں آئے اور ان کی یہ کاوش ''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز'' کے نام سے وجود میں آئی۔ یہ سفر نامہ صالحہ عابد حسین نے 1982 میں مکتبہ جامعہ

لمیٹڈ، دہلی سے شائع کرایا۔اس سفرنامے میں انھوں نے اپنی زندگی کے تمام سفر کے تجربات ومشاہدات کو بیان کیا ہے اوراس بات کی حتی الامکان کوشش بھی کی ہے کہ یہ سفرنامہ خودنوشت سوانح عمری نہ بننے پائے، کیوں کہ اس سفرنامہ میں ہندستان کے مختلف شہروں کا جو ذکر کیا ہے اس سے ان کا تعلق سفر سے نہیں تھا۔کبھی کسی شہر میں انھوں نے بغرض اپنے شوہر کی ملازمت کے سلسلے میں قیام کیا تو کبھی کسی رشتے دار کے گھر پر، لیکن روداد سفر بیان کرتے وقت وہ سفرنامہ میں صرف ایک سیاح کی حیثیت سے دکھائی دیتی ہیں۔ ہندستان کے مختلف شہروں کے علاوہ صالحہ عابد حسین کے غیر ملکی سفر کے تجربات ومشاہدات بھی اس سفرنامے میں شامل ہیں، جن میں جرمنی، انگلینڈ، پاکستان، ایران، عراق اورسعودی عرب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایران، عراق اور سعودی عرب کا سفر خاص عقیدت کے تحت کیا گیا ہے، لیکن جرمنی ، پیرس، انگلینڈ کے روداد سفر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادیبہ کی نظر سے ان شہروں کو دیکھ رہی ہیں۔ان کا پہلا باقاعدہ سفر جرمنی کا 1953 میں ہوا، جو کہ پانی کے جہاز سے تھا۔ اس کے بعد ایران کا سفر 1962 میں اوراسی سفر سے واپسی میں پاکستان گئیں۔سعودی عرب کا سفر بغرض حج 1968 میں کیا۔ان کے تمام اسفار میں ان کے شوہر عابد حسین بھی ساتھ تھے۔ان کے سفر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ جرمنی جانے کے بعد صالحہ عابد حسین دمہ کے مرض میں مبتلا ہوگئیں اور صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کے شوہر جس کام کے لیے جرمنی گئے تھے اس میں خلل واقع ہونے لگا تھا، جس کی وجہ سے وہ تن تنہا جرمنی سے بذریعۂ ہوائی جہاز وطن واپسی پر مجبور ہوئیں۔ یہ ان کا پہلا سفر تھا جو انھوں نے تنہا کیا تھا۔ یہ سفر کئی اہمیتوں کا حامل ہے۔اس میں ایک عورت کی سیاحتی نظریہ کے علاوہ ایک ادیبہ کے تجربات ومشاہدات کو دیکھا جاسکتا ہے۔عہد حاضر میں عورتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تو دور کی بات ہے، وہ تنہا دور دراز علاقوں کا سفر بھی نہیں کرتی ہے، اگر کوئی عورت کسی کے ساتھ سفر کرتی ہے تو اس کے فکر اور تجربات اتنے محدود ہوتے ہیں کہ وہ وطن واپسی کے بعد رودادِ سفر کے بیان میں اس بات کا خیال ہی نہیں رکھتیں کہ کس چیز کو بیان کرنا ہے اور کس کو نہیں۔ ایک عام عورت جب عورتوں کے بیچ بیٹھ کر روداد سفر بیان کرتی ہے تو ممالک غیر کی چکاچوند کو ہی سرسری طور پر بیان کردیتی ہے اور سننے والی عورتوں کو ان کی بات میں لطف اور مزہ بھی آتا ہے۔ چونکہ یہ عورتیں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتی ہیں، لیکن صالحہ عابد حسین نے اپنے سفرنامے میں واقعات کو کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ عام عورتوں کی روداد سفر اس سے کافی مختلف ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر حسن ظہیر ہمیں فرانک فورٹ بلا رہے تھے۔ یہ جرمنی کا بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ گوئٹے کا وطن بھی ہے۔ہم وہاں گئے۔ بہت کچھ دیکھا وہاں مگر سب سے زیادہ شوق سے گوئٹے کا مکان، اس کا سامان، نوادرات کو دیکھا جسے اس کی قوم نے جان سے عزیز رکھا ہے۔ یہاں ایک انٹرنیشنل نمائش ہو رہی تھی ایک شام اس کی نذر کی۔اب تو خود ہمارے ہاں اس سے بڑی نمائشیں ہونے لگی ہیں۔مگر اس وقت یہ بہت عجیب اور شان دار لگی۔''

(صالحہ عابد حسین؛ سفر زندگی کے لیے سوز وساز، نئی دہلی؛ مکتبہ جامعہ، 2011ء، ص:74)

درج بالا اقتباس میں بیان کردہ معلومات عام گھریلو عورت کی سوچ سے کافی دور ہے۔ اگر عام گھریلو عورت جرمنی کے سفر پر جائے گی تو وہ وہاں کی اونچی اونچی عمارتیں، دریا اور کھانے پینے کی انواع واقسام کے بیان پر ہی اکتفا کرے گی، کیونکہ انھیں گوئٹے اور ملٹن جیسی نامور شخصیات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ اول تو ایسی عورتیں گوئٹے کو جانتی ہی نہیں تو ان کے مکان اور سامان سے انھیں کیا دلچسپی ہوگی۔اس کے برعکس تعلیم یافتہ عورت گوئٹے اور ملٹن کو سنتے ہی اس کے مکان وسامان کی زیارت کی خواہش مند ہوگی۔ صالحہ عابد حسین نے ایک ادیبہ و مفکر کی نظر سے جرمنی کی تہذیب وثقافت کو دیکھا، دوسرے یہ کہ انھوں نے مغربی ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا جس کی وجہ سے وہ گوئٹے کی شخصیت اور ادبی کارنامے سے باخبر تھیں۔

مردوں کے مقابلے خواتین کے سفرنامے میں بہت ساری باتوں اور تجربات ومشاہدات کے بیان میں فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ادب میں مردوں کے سفرنامے ہمیشہ سے غالب رہے ہیں اور ان ہی کے سفرناموں کا زیادہ تر تنقیدی تجزیہ بھی کیا گیا ہے، مگر عورتوں کے سفرنامے کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، جب کہ عورتوں کے سفرنامے میں بہت ساری معلومات ایسی ہوتی ہیں جہاں مرد کی نگاہ پہنچ ہی نہیں سکتی، کیوں کہ زنانہ خانے کی روداد مرد بیان کرنے سے قاصر ہے۔حج کے مبارک موقع پر عرفات میں عورتوں کے کیمپ کا نقشہ صالحہ عابد حسین نے کچھ یوں کھینچا ہے:

''میدان عرفات کی وسعت کا کیا کہنا۔اس بے پناہ وسیع میدان میں لاکھوں خیموں کا ایک جنگل تھا۔سامنے تاریخی مساجد وغیرہ تھیں جن کی دور ہی سے زیارت کر پائے۔ ہندستانی سفارت خانہ کے کیمپ کے ایک خیمے میں ہمارے قافلے کی خواتین موجود تھیں۔ میں بھی اپنی حمائل اور دعاؤں کی کتاب لے کر ایک کونے میں جا بیٹھی اور پڑھتی رہی۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ بھوک سے برا حال۔ مگر کھانے کا پتا نہیں۔ معلوم ہوا کہ دوسرے خیموں میں جا کر ہماری ساتھنیں خوب پلاؤ زردہ اڑا آئیں۔" (ص:152)

ایک جگہ اور لکھتی ہیں:

"سفارت خانہ سے کھانا اچھا اور کافی مقدار میں آتا تھا مگر (خدا معاف کرے) خواتین اس بری طرح ٹوٹتی تھیں۔ کسی کسی کی یہ آواز کان میں پڑ جاتی کہ "نہ نہ- بچاری کی یہ حالت ہے بھوکی بھی ہوگی۔" اور میں ہمت کر کے کچھ کھانے کو اٹھتی تو دستر خوان اکثر صاف ملتا۔" (ص:151)

'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' میں نسوانی جذبات کی خوب صورت عکاسی ملتی ہے، چوں کہ ایک عورت کی تحریر میں لاشعوری طور پر نسوانی جذبات کا درآنا فطری ہے۔ سماج مرد اور عورت کے باہم اشتراک سے بنتا ہے اور عورتوں کے جذبات کی عکاسی ایک مرد اس انداز میں نہیں کر سکتا ہے جس انداز میں ایک عورت کر سکتی ہے۔ چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت انسان میں یکساں نہیں ہوتی ہاں کچھ جذبات اور مشاہدات ایسے ہوتے ہیں جو مردوں کی نگاہ میں الگ ہوتے ہیں اور عورتوں کی نگاہ میں الگ۔ یہ حقیقت ہے کہ دوران سفر ایک سیاح کی نگاہ سے کئی سارے واقعات ایسے بھی گزرتے ہیں، جنھیں وہ بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کشمیر کے ایام قیام میں وہاں کی حسین وادیوں، دلفریب نظارے اور حسن کو کچھ یوں بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

"یوں تو کشمیری حسینائیں ہر جگہ نظر آتی ہیں مگر یہاں یہ حسن کچھ اور بھی بڑھا ہوا ہے۔ ایک بچی یہاں ایسی دیکھی جس کی موہنی صورت آج بھی میرے دل پر نقش ہے، کوئی سات آٹھ برس کی بچی، میلا سا ڈھیلا پھرن پہنے، اور ٹوپی میں چاندی یا گلٹ کے کشمیری چاند سورج اٹکائے، کانوں میں بالیوں کے گچھے لٹکائے ہماری کار کے پاس کھڑی ہوگئی اور بچے "بوسہ"۔ "بوسہ" مانگ رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ نہایت حسین کھلتا ہوا گیہواں رنگ سیاہ غزالی آنکھیں، آدھے چاند کا سا ماتھا، کشمیری سیب کے سے سرخ گال اور گلاب کی پنکھڑی کے سے ہونٹ۔ کیا پیارا چہرہ تھا۔ کتنی معصومیت اور ساتھ ہی وقار تھا اس حسن میں۔ اسے دیکھ کر بے اختیار یہ جی چاہا کہ اسے گود میں اٹھا کر موٹر میں بیٹھ جاؤں اور اسے اغوا کر لاؤں۔ کاش یہ میری بچی ہوتی۔ گدڑی کے اس لال کی یاد آج تک آتی ہے۔" (ص:13)

صالحہ عابد حسین ہندستانی تہذیب و تمدن کی پیرو کار تھیں وہ لندن بھی گئیں تو اس تہذیب کو اپنانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اپنے ہی لباس اور کھان پان کو وہاں بھی برقرار رکھا، ہاں! وہ وہاں کی بعض تہذیبی زندگی کی قائل ضرور ہوئیں، لیکن بعض کو وہ برا تصور بھی کرتی تھیں، جن باتوں کو وہ 1953 میں برا مانتی تھیں وہی برائی سفرنامہ تحریر کرتے وقت ان کے ملک میں بھی درآئی تھی، جس کا انھوں نے سفرنامہ تحریر کرتے وقت اعتراف بھی کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے جرمنی میں رہتے ہوئے انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش بھی کی اور ساتھ ہی انھوں نے یہاں کی تہذیبی زندگی کو غور سے بھی دیکھا، خاص کر گھریلو زندگی کی نفاست کو جب سفرنامہ میں بیان کرتی ہیں تو اس سے جرمنی کی ترقی یافتہ زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جرمنی کے سفر میں صالحہ عابد حسین کے شوہر (ڈاکٹر عابد حسین) کے کئی جاننے والے ان کی مہمان نوازی میں ہمیشہ لگے رہتے تھے۔ صالحہ عابد حسین جرمن زبان بالکل نہیں جانتی تھیں، لیکن شوہر کی موجودگی میں زبان کی دیوار کہیں حائل نہیں ہوئی۔ جرمنی کے ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"عابد صاحب چوں کہ اعلا درجے کی جرمنی جانتے تھے اس لیے سبھی لوگ ان سے بہت جلد گھل مل جاتے اور بے حد عزت اور احترام سے ملتے کہ اس دیس میں پروفیسر کو وہ عزت حاصل ہے جو پرائم منسٹر کو بھی نہیں ہندستانی عورت کو پہلی بار دیکھا تھا اور شاید اس ناتے ہر شخص مجھ سے خصوصیت کرتا تھا۔ ڈائننگ ہال میں جاتی تو طالب علم، استاد سبھی مڑ مڑ کر دیکھتے اور پھر شرمندہ سے ہو کر سر جھکا لیتے۔ شروع میں تو بہت نروس ہوتی تھی۔ پھر عادت پڑ گئی۔ تھوڑی تھوڑی زبان بھی سیکھ لی۔ باہر دکانوں پر خریداری کرنے جاتی تو دکاندار کچھ زیادہ ہی اخلاق سے پیش آتے اور بچے تو مسلسل ساتھ لگے رہتے۔ میں کبھی کسی کا گال چھو لیتی یا پیار کر لیتی یا ایک آدھ بات تو بہت خوش ہوتے اور ان سے زیادہ ان کی مائیں۔" (ص:50-51)

جرمنی کے علاوہ صالحہ عابد حسین نے پیرس، انگلینڈ اور پاکستان کا بھی سفر کیا تھا اور ہر ملک کی تہذیبی زندگی سے متاثر ہوئی تھیں۔ جرمنی کے دوران سفر ان کو یہاں کی تہذیبی زندگی سے الگ محسوس ہونے پر مایوسی بھی ہوئی تھی، لیکن انھوں نے خود کو شرمندہ نہ ہونے دیا اور نہ ہی انھیں اپنی تہذیب پر رونا آیا۔ علاوہ ازیں صالحہ عابد حسین نے یوروپ کے قدرتی

مناظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ پہاڑوں، جھیلوں اور خوب صورت مناظر کا ذکر کرتے ہوئے داد بھی دیتی ہیں۔ یہاں پر عرض کر دینا ضروری ہے کہ ایسا صرف ان کے یوروپ کے رودادِ سفر میں دیکھنے کو نہیں ملتا بلکہ وہ ہندستان کے مختلف شہروں کے قدرتی مناظر کا ذکر بھی اسی انداز میں کرتی ہیں، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صالحہ عابد حسین کو مناظر فطرت سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس جگہ بھی رہیں مناظر فطرت کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتی تھیں۔ سمندر کا سفر ہو یا ٹرین کا وہ قدرت کے حسین مناظر کو اپنی آنکھوں سے ایک پل کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔ جرمنی کے مختلف شہروں کی سیر کرنے کے بعد وہاں کے قدرتی و مصنوعی مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ایک ٹیورسٹ بس میں بیٹھ کر سارے شہر کا چکر لگایا اور قابل دید مقامات دیکھ ڈالے۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ...پھر ایک دن کے لیے ہم لُتسرن گئے۔ ٹرین نے ڈیڑھ گھنٹے میں ہمیں اس ارضی جنت میں پہنچادیا۔ یہ مقام سوئزش سے بلند ہے۔ وسط شہر میں "لتسرن جھیل" واقع ہے۔ یہ اگرچہ چھوٹی ہے مگر اس کا حسن، دلکشی اور اس کے کناروں کی خوب صورتی، اس کے اطراف میں گہرے کاہی رنگ کے پہاڑوں کی گوٹ، کناروں پر چھوٹے چھوٹے رنگین اور خوب صورت کیفے، جھیل میں نہایت خوب صورت کشتیاں تیرتیں اور راج ہنس اور بطخیں کللیں کرتے ہوئے بس دیکھنے کی چیز تھی اور بار بار دیکھ رہے تھے۔ جی نہ بھرتا تھا۔ مگر ایک ہی دن تو ملا تھا۔ آخر واپس آنا تھا۔" (ص 77-76)

دوران سفر صالحہ عابد حسین کی بیماری نے انھیں سفر کی مفید لذتوں کے بہت سارے مواقع سے محروم کردیا تھا، لیکن ان کی بیماری نے ان کے حوصلوں کے آگے سرخم کردیا۔ بیرونی ممالک کے تقریباً تمام سفر میں انھیں اپنی بیماریوں سے پریشانی اٹھانی پڑی تھی اور یہی ایک وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ کسی بھی ایک سفر کی مکمل روداد بیان کرنے سے قاصر رہی ہیں۔ یوروپ کے دوران سفر بھی انھیں دمہ کی بیماری کی وجہ سے قبل از وقت واپس آنا پڑا، لیکن جتنی بھی مدت وہ یوروپ میں رہیں، یہاں کی تہذیبی زندگی کو اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر رقم کردیا جن میں ان کے افکار و نظریات کو بھی بغور دیکھا جاسکتا ہے۔ ہمارے سماج میں عورتوں کا سفر کرنا مشکل امر ہے، لیکن سفر کرتی بھی ہیں تو وہ صالحہ عابد حسین جیسی سیاحت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ ہندستان میں ایسی عورتیں بہت کم ہیں جن کے سفر کی روداد تحریری شکل میں دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن جتنے بھی سفرنامے تحریری شکل میں موجود ہیں وہ ایک عورت کی بلند حوصلگی کو بیان کرتے ہیں اور اس بات کو بھی عیاں کرتے ہیں کہ آج کی عورت مرد کی طرح اپنے تجربات و مشاہدات کو لوگوں تک پہنچا سکتی ہے۔ دوران سفر صالحہ کو عورت ہونے کی بنا پر بہت ساری مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا جیسے کہ انھیں یوروپ کے سفر کے دوران اپنی وضع قطع میں رہنے کی وجہ سے لوگوں کا مڑ مڑ کر دیکھنا۔ دوسری طرف ایران، عراق اور سعودی عرب میں عورتوں کی بے بسی اور لاعلمی اور جگہ جگہ پر بے جا پابندیاں انھیں راس نہیں آئیں۔ صالحہ عابد حسین نے ایران، عراق اور سعودی عرب کا سفر خالص مذہبی رسومات کی ادائیگی کی غرض سے کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی روداد سفر میں مذہبی نوعیت کے ہی افکار و نظریات دیکھنے کو ملتے ہیں:

اسی طرح سعودی عرب میں اس وقت بہت زیادہ مایوسی ہوئی جب انھیں وہاں کی بعض جگہوں پر جانے سے روکا گیا اور یہ ممانعت ان کے عورت ہونے کی وجہ سے تھی۔ ایران، عراق اور سعودی عرب کی مذہبی رسومات کو بیان کرنے کے علاوہ مصداق فاطمہ یہاں کی پہاڑیوں، جھیلوں، باغات اور بازاروں کے حسین مناظر کو بھی اپنے مشاہدات میں جگہ دیتی ہیں اور سفرنامہ تحریر کرتے وقت ان حسین وادیوں میں کھو جاتی ہیں، پھر بھی عراق، ایران اور سعودی عرب کے رودادِ سفر میں مذہبی رسومات کا ہی ذکر غالب نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سفرنامہ مختلف روداد سفر کا مجموعہ ہے۔ جس میں صالحہ عابد حسین نے جرمنی، عراق، ایران اور سعودی عرب کے روداد سفر کے ساتھ ہندستان کے مختلف شہروں کا ذکر بھی سرسری طور پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفرنامہ 'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' میں کہیں کہیں خود نوشت کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ منظر نگاری میں تشبیہ و استعارے کا استعمال کرتے ہوئے افسانوی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال یہ سفرنامہ نسوانی جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

□□□

Mohammad Amir
Room No. 002
Narmada Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
Mob: 9868561984
Email: mohdamir56@gmail.com

شاعرات کے منتخب اشعار

آ کر ملا مجھے وہ دم واپسیں کے وقت
ارمان وصل سے تو رہائی مجھے ملی

جبیں کرتی تھی سرفراز اپنی خوب سجدوں سے
تمہارے عشق کی جاناں لگن دل میں کچھ ایسی تھی

بیگم رضیہ حلیم جنگ

اچھا ہی ہے جو مل نہ سکا چارہ گر مجھے
ہونا پڑا کسی کا نہ دریوزہ گر مجھے

ہر خار رہ الجھتا ہے دامان شوق سے
لے جائے گی یہ آبلہ پائی کدھر مجھے

ساجدہ زیدی

بے آس ساعتوں میں ترا نام یوں لیا
خوشبو نے جیسے راہ سفر کا شگوں لیا

میں آئینے پہ بھلا اعتبار کیسے کروں
مجھے تو صرف اسی کی نگاہ نے دیکھا

ادا جعفری

یہ قدم قدم پہ بندش یہ روش روش پہ پہرے
کہ نہ رو سکے لپٹ کے کوئی خاک آشیاں سے

نسیم قافلے والوں سے کوئی یہ پوچھے
یہ کیا ہوا سرِ منزل جو سر جھکا کے چلے

وحیدہ نسیم

سکوں ملا ہی نہیں دل کو ویسے ہر لمحہ
سکوں سے گزرے جو لمحے تمھارے نام رہے

آباد ہے اک درد کی دنیا مرے دل میں
کھلتا نہیں کب اور کہاں چوٹ لگی ہے

زبیدہ تحسین

صبا سے پوچھیے کیا گل کھلائے
چمن میں اس کی آہستہ روی نے

پھر کوئی آئے عیادت کے لیے ممتاز جی
پھر نصیب دشمناں ہم آج کل بیمار ہیں

ممتاز مرزا

کب تک جاں کو خاک کرو گے کتنے اشک بہاؤ گے
اتنے مہنگے داموں آخر کتنا قرض چکاؤ گے

کل یہ سمندر خشک ہوا تو طرز ندامت کیا ہوگی
کل یہ صحرا گرد ہوا تو کون سے رستے جاؤ گے

زہرا نگاہ

ہم نفس کوئی نہیں ہم قدم کوئی نہیں
گر مرا عکس بھی پڑتا تو پرایا ہوتا

ایک زندانِ حوادث میں ہے یا بستہ حیات
فکر آوارہ سے پوچھو کہ کدھر جائے گی

زاہدہ زیدی

شبانہ عشرت

سلطان اختر کی تحسینی رباعیاں

گزشتہ برسوں کے دوران عالمی وبا کی پر دہشت صبح و شام میں نہ جانے کتنے ہی علما و ادبا اور شعرا ہم سے سدا کے لیے بچھڑ گئے۔ انھیں فن کاروں میں میرے استاد محترم سلطان اختر کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ان کی اصل شناخت اور شہرت ان کی غزلوں سے ہے۔ بیشک وہ ''سلطانِ غزل'' کہلانے کے حقدار تھے اور اب بھی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے صنف رباعی کو بھی اپنے رشحاتِ قلم سے کچھ اس طرح نوازا کہ انھیں ''سلطانِ رباعیات'' کہا جائے تو چنداں مبالغہ نہ ہوگا۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی ایک صنف میں شاعر کے کمالات کا شہرہ، دوسری صنف کے حوالے سے اس کے امتیازات پر تادیر توجہ دینے کا موقع نہیں دیتا اور یقیناً سلطان اختر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ رباعی نگاری کی طرف ذرا دیر سے آئے اور ان کی غزل گوئی کا غلغلہ کچھ اس طرح چھایا رہا کہ اس صنف کے حوالے سے ان کے اکتسابات پر تا حال زیادہ نہیں لکھا جا سکا ہے۔

جہاں تک اصناف شاعری کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک قصیدہ و مرثیہ جیسی موضوعی صنف اور دوسری غزل اور رباعی جیسی وہ صنف جس کی بنیاد ہیئت پر ہے۔ رباعی عام طور پر فلسفیانہ، عرفانی، تقدیسی، تفکیری اور عشقیہ مضامین پر مبنی ہوتی ہے، لیکن اس کا عام رنگ، غنائی ہوتا ہے۔ یعنی وہ اصلاحی اور خطابیہ انداز سے عموماً گریز کرتی ہے۔ رباعی کی تعمیر و تشکیل میں سب سے آسان چیز اس کی ہیئت ہے اور یقیناً اس صوری ہیئت میں کچھ ایسا انوکھا پن نہیں جو اُسے صنف کی حیثیت سے شناخت دے سکے، اس کی صنفی شناخت کا جو کچھ دار و مدار ہے وہ ان مخصوص اوزان میں پنہاں ہے، جن میں سے اگر کسی ایک وزن میں بھی کوئی دو شعر یا چار مصرعے نہ ہوں تو وہ قطعہ کے روپ میں ڈھل جاتی ہے اور رباعی کہلانے کا حق کھو دیتی ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے، جہاں ٹھوکریں لگتی ہیں اور احساس بھی نہیں ہوتا، اس عدم احساس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہوا کرتی ہے کہ مصوتوں کی ادائیگی کے دوران کسی مصوتہ پر کم یا کسی پر زیادہ بل دینے کی وجہ سے تلفظ کا فرق گرفت میں نہیں آپاتا ہے یا شاعر اس کا واضح شعور نہیں رکھ پاتا ہے اور اس طرح دبے پاؤں تلفظی تبدیلی، قرأتی تبدیلی میں بدلتی ہے اور بصورت تقطیع رباعی کی صنفی شناخت اپنی سلامتی کھو دیتی ہے اور کامیاب رباعی گوئی کے دعوے سوالیہ نشانوں کے حصار میں آ جاتے ہیں، البتہ ایک عام اندازے کے بموجب ہمارے لیے یہ اطمینان کی بات ہے کہ سلطان اختر کی رباعیاں چاہے تعداد میں زیادہ سے زیادہ نہ ہوں، لیکن اس آفت عروضی سے بیش از بیش محفوظ ضرور ہیں اور اس کی وجہ، جہاں تک میں محسوس کرتی ہوں، یہ بھی ہے کہ وہ مصوتوں کی درست ادائیگی کا عملاً التزام رکھتے تھے اور بہت توجہ سے دورانِ اصلاح تفاوتی جہات بتاتے ہوئے اس کی مشق بھی کرا دیتے تھے۔

سلطان اختر نے کب سے رباعیاں کہنا شروع کیا؟ ان کی پہلی رباعی کون سی ہے اور کتنی رباعیاں کہہ کر وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے، افسوس کہ ان سوالوں کا واضح جواب ہمارے پاس نہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کی رباعیوں کا کوئی مجموعہ تا حال منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ بس مصدقہ اطلاع ہے تو اتنی ہے کہ ان کی تراسی (83) رباعیوں کا ایک مسودہ

تیار ہو چکا تھا جس کے مطالعہ کا ذکر ڈاکٹر منظر اعجاز نے اپنے ایک مقالہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''میری تحویل میں، میرے پیش نظر یا زیر مطالعہ (سلطان اختر) کی تراسی (83) رباعیاں ہیں جن میں بیشتر شاعر وادیب کے نام ہیں۔ پانچ رباعیاں حضرت عباس علمبردار کی شان میں ہیں۔ مسودہ پر تاریخ تخلیق 6۔11۔22 درج ہے۔''

(مقالہ ''سلطان اختر کی رباعیاں'' ڈاکٹر منظر اعجاز، مشمولہ سلطان اختر، جدید اردو غزل کی معتبر آواز، مرتبہ یاسمین بانو، شائع کردہ مکتبہ صدف، پٹنہ، 2016ص 347)

سلطان اختر کی رباعیات کے تعلق سے ڈاکٹر محمد شیراز حمیدی کا بیان بھی یہی ہے کہ:

''ان کے یہاں عام موضوعات کے علاوہ شخصی رباعیات کی تعداد بھی کثیر ہے۔'' (سلطان اختر کی شاعری، 2014، ص110)

اس مقام پر ذرا سا رک کر اگر یہ بات بھی ضبط تحریر میں لا دی جائے تو شاید نامناسب نہ ہوگی کہ رباعیوں کے ساتھ موضوع لکھ دینے یا یہ کہ یک موضوعی رباعیاں کہنے کی روایت بہر حال قدیم ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے شعرا کے یہاں اس کی یک جائی کا شعوری اہتمام بھی بڑھا ہے۔ ''شخصی رباعی'' کا کھلا مفہوم یہی ہے کہ وہ رباعی جو کسی شخصیت پر لکھی گئی ہو اور ''تحسینی رباعی'' سے کھلے طور پر وہ رباعی مراد ہے جو کسی شخصیت کی تحسین وتعریف پر مبنی ہو۔ البتہ ان دونوں اصطلاحوں میں ذات اور بات کے حوالے سے باریک فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بیان میں اگر شخص کی طرف جھکاؤ نسبتاً نمایاں ہو تو وہ ترجیحاً ''شخصی رباعی'' ہے اور اگر اس شخص کے کارناموں کی طرف جھکاؤ نسبتاً واضح ہو تو اسے ترجیحی طور پر ''تحسینی رباعی'' کہنا انسب ہے۔ یہاں میرے مقالے کا عنوان ''سلطان اختر کی تحسینی رباعیاں'' ہے، لیکن اس پر اپنے تجزیاتی اظہار سے پہلے مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر منظر اعجاز کی یہ سطریں یہاں جگہ پالیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''سلطان اختر نے جن ادبی شخصیتوں پر رباعی کہی ہے ان کے شخصی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ادبی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ شخصی مزاج، میلان اور مذاق و معیار کو بھی موضوع بنایا ہے۔ کہیں کہیں تدریس وتلقین کا عنصر بھی نظر آتا ہے جو خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ نہیں بلکہ شاعرانہ اور ہمدردانہ ہے اور اس سے باہمی تعلقات ومراسم اور رشتے کی نزاکت و نوعیت ظاہر ہوتی ہے۔ کہیں کہیں شکوہ سنجیاں بھی ہیں جو انس و محبت اور خلوص سے بھرپور ہیں۔ کہیں تاسف آمیزی ہے تو کہیں تحیر خیزی۔ مایوسی، محرومی اور محزونی کیفیات بھی ہیں۔ آشوب روزگار پر اظہار رنج وغم بھی ہے۔ یعنی مضامین و موضوعات اور کیفیات وتاثرات کے اعتبار سے بھی یہاں تنوع، رنگارنگی اور بوقلمونی نظر آتی ہے۔''

(مقالہ ''سلطان اختر کی رباعیاں، مشمولہ سلطان اختر: جدید اردو غزل کی معتبر آواز، مرتبہ یاسمین بانو، ص355)

اسی طرح ڈاکٹر محمد شیراز حمیدی نے بھی لکھا ہے:

''سلطان اختر کی یہ رباعیاں ذاتی نوعیت کی ہیں اور ان میں متعلقہ اشخاص کی ہی باتیں ہیں، لیکن ان شخصیات کی زندگی اور ان کی خصوصیات اس طرح نظم ہوئی ہیں کہ ہمیں تحریک بھی ملتی ہے اور حوصلہ بھی جاگتا ہے۔''

(سلطان اختر کی شاعری، ص115)

مذکورہ اقتباسات میں جو باتیں آئی ہیں، اس کی مزید تفصیل میں جانے کا نہ تو یہ موقع ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت۔ رباعی ایک ارتجالی صنف شاعری ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، قدرت نے سلطان اختر کو دیگر شخصی وشعری اور فکری وفنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بدیہہ گوئی و برجستہ گوئی کی بے پناہ صلاحیت سے بھی نوازا تھا۔ وہ خاص خاص مواقع پر فی الفور، بصورت رباعی اپنے خیالات پیش کر دیتے تھے۔ بسا اوقات تو وہ اسٹیج پر تشریف فرما رہتے ہوئے اپنی اس صلاحیت سے صدارتی خطاب یا اظہار تشکر کی ضرورت بھی، بہت آسانی سے پوری کر لیتے تھے۔ بہر کیف! یہاں تحدید موضوع کی شرط کے ساتھ سلطان اختر کی رباعیوں کا مختصر تجزیہ مطلوب ہے اور اس تعلق سے جو مختصر سا سرمایہ ہماری دسترس میں ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مختلف اصناف نثر ونظم کے مشاہیر ادبا وشعرا پر رباعیاں لکھی ہیں۔ ان کی شخصی اور تحسینی رباعیات میں عام وخاص کا رشتہ بالکل ہی واضح ہے، یعنی ان کی تحسینی رباعیاں تو شخصی رباعیاں ضرور ہیں، مگر ان کی سبھی شخصی رباعیاں، بلاتکلف تحسین رباعیوں کے زمرے میں نہیں رکھی جاسکتیں۔

روشن ہی نظر آئیں گے افکار جمیل
پڑھنے کی طرح پڑھیے تو اشعار جمیل
دستار نہ گر جائے کہیں دیکھنے میں
ہے سر بہ فلک آج بھی معیار جمیل

درویش صفت ارفع و دانا وہ تھے
اور دانش و حکمت کا خزانہ وہ تھے

نوحہ ہو ، قصیدہ ہو کہ ہو طنز و مزاح
ہر صنف میں یکتائے زمانہ وہ تھے

یہاں اول الذکر رباعی جمیل مظہری کے نام ہے اور موخرالذکر رباعی ان معنوں میں یک گونہ مجرد بیان کی حامل ہے کہ اسے شاعر نے پروفیسر مہدی علی کے نام لکھا ہے، مگر کہیں ان کے نام کا اشارہ نہیں اور یہ کہ ذات کا حوالہ کم اور بات کا حوالہ بہرحال زیادہ ہے۔ چند رباعیاں اور دیکھیے ؎

نظموں میں جو روشن ہے فسوں تیرا ہے
صحرائے غزل میں بھی جنوں تیرا ہے
ہر بند میں چستی ہے تو ہر شعر سبک
کہنے کا جو انداز ہے یوں ترا ہے

یہ جلتے پگھلتے ہوئے حالات ظہیر
ہر لمحہ نئے خواب کی برسات ظہیر
کس قہر کے موسم نے جکڑ رکھا ہے
کب اتنے جنوں خیز تھے دن رات ظہیر

کیوں دل کا لہو کرتا ہے پانی فکری
ہر اک سے نہ کہہ اپنی کہانی فکری
تو حرف غلط ہے کہ نہ روشن ہوگا
چمکے گی بہت تیری نشانی فکری

یہاں پہلی رباعی مظہر امام کے نام ہے، مگر اس میں بہرحال بیاں تجرد بداماں ہے جب کہ دوسری رباعی میں عصری تناظر کے ساتھ ظہیر صدیقی کے یہاں ''ہر لمحہ نئے خواب کی برسات'' کا ذکر ہوا ہے اور تیسری رباعی میں شاعر جذبہ اصلاح کے ساتھ پرکاش فکری سے مخاطب ہے۔

سلطان اختر کی ان رباعیوں پر ایک بار اور نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں غنائیت ضرور ہے، مگر اپنی تحسینی رباعیوں میں بہرحال انھوں نے نہ تو اصلاحی انداز سے گریز کیا ہے اور نہ ہی خطابیہ انداز سے، یہ روش عام سے ذرا سا ہٹ کر رباعی کہنے کی برجستہ مثال ہے جو وسیع تناظر میں ان کی قوت بھی کہلا سکتی ہے اور کمزوری بھی، پھر یہ کہ انھوں نے اپنی تحسینی رباعیوں کو حوصلہ افزائی کی قدروں سے بھی بیگانہ نہیں ہونے دیا ہے۔

سلطان اختر نے صرف شاعروں کے نام ہی تحسینی رباعیاں نہیں لکھی ہیں بلکہ نثر نگاروں کے نام بھی ان کی متعدد تحسینی رباعیاں ملتی ہیں ؎

ہر اک ادا تنقید کی پہچانتا ہے
کب اُگلے ہوئے قول کو گردانتا ہے
ذی علم ، ہے خوش فکر و فراست ہے وہاب
لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتا ہے

ہر چند کہ تصویر پرانی ہے غیاث
صد نقش ہنر تیری نشانی ہے غیاث
روشن ہے مرے دل میں حقیقت کی طرح
''افقی''، کہ جو کہنے کو کہانی ہے غیاث

آنکھوں میں ہے گزرا ہوا منظر شوکت
ہر سمت ہیں بکھرے ہوئے کچھ پر شوکت
محفوظ کہیں بھی نہیں اب جائے پناہ !
سر گرداں ہیں ''گنبد کے کبوتر'' شوکت

مذکورہ رباعیاں بالترتیب وہاب اشرفی، غیاث احمد گدی اور شوکت حیات کے نام ہیں اور واضح طور پر سلطان اختر کی تحسینی رباعیوں کا بہترین نمونہ کہلانے کا حق رکھتی ہیں۔ ان رباعیوں کے مضامین سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بصورت تحسین شاعر نے اپنے ممدوح کی ادبی شخصیت، اس کے اسلوب کی انفرادی جہتوں کے حوالے سے اُبھارا ہے اور مزید کہ ان رباعیوں میں شاعرانہ صنعتوں کا حسن استعمال بھی پنہاں نہیں رہتا۔

ہوسکتا ہے کہ آنے والا وقت سلطان اختر کی ٹوکری بھر رباعیوں سے نواز دے، مگر اس وقت مٹھی بھر کیا، یوں کہیں کہ حسب موضوع ان کی بہت کم رباعیاں ہی میرے مطالعہ کی میز پر ہیں، لیکن اگر ایک تنکا ہوا کا رخ بتا دیتا ہے تو شاید یہ کہنے میں، بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ شخصی اور خصوصاً تحسینی رباعیات میں سلطان اختر کی باقیات اپنی عظمتوں کا احساس دلا جاتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی رباعیات کا مجموعہ یکی روشنائی میں سامنے آئے تا کہ سلطان غزل کو سلطان رباعیات کی حیثیت سے دیکھنے اور دکھانے اور اس سے مسرت وبصیرت پانے کی صورتیں ارزاں ہوسکیں۔

□□□

Shabana Ishrat
C/o Md. Faizan Ahmad
Near Sona Medical
Dargah Road
Pathar Ki Masjid
Patna - 800006 (Bihar)
Mob. 8409722347

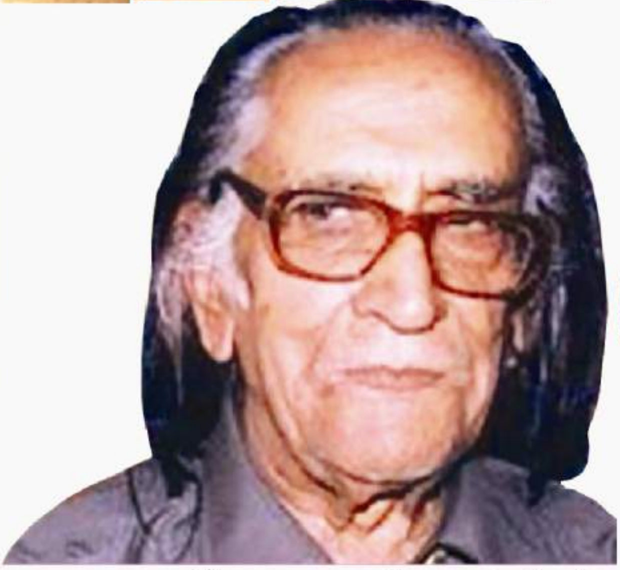

تنویر احمد علوی
بحیثیت محقق و مدون

تحقیق ایک مشکل ترین فن ہے۔ اس کی شہادت تاریخ وتہذیب اور محققین ادب کی محدود تعداد سے ملتی ہے۔ اردو ادب کے دیگر اصناف میں اس کے برعکس جم غفیر کا معاملہ ہے۔ مگر تحقیق کے میدان میں ایسا نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ صنف اپنے دامن میں چند سپہ سالاروں کی شمولیت کے ساتھ مستحکم طریقے سے اپنے عروج کی جانب رواں دواں ہے اور یہی وہ فن ہے جو علم وادب کے استحکام واستناد کا مظہر ہے۔ علاوہ ازیں تحقیق کا حسن بھی تنقید کے آرٹ کے بغیر ادھورا ہے۔ اردو ادب کو باعث افتخار بنانے اور اس کے معیار وتوازن کو برقرار رکھنے میں مولانا محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، رشید حسن خاں، گیان چند جین، مشفق خواجہ، خلیق انجم وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اہم محققین کی اس فہرست میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی شخصیت بھی قابل قدر ہے۔ اردو ادب میں تنویر احمد علوی کی بنیادی شناخت تو ایک محقق کی ہے مگر انھوں نے تنقید، ترجمہ نگاری، لسانیات اور شاعری کی حیثیت سے بھی اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔ علوم وفنون پر ان کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ انھیں چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا بھی کہا جاتا تھا۔ ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان کتابوں میں ''فن تذکرہ نگاری اور عصری رجحانات (ایک مطالعہ)''، ''تجسس سے تجزیہ تک''، ''جنوب مغربی ایشیا میں ہمارا تہذیبی ورثہ''، ''کلاسیکی اردو شاعری کے روایتی ادارے کردار اور علامتیں'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب کے فارسی خطوط، فارسی تصوف کی کتابوں اور بارہ ماسوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ تنویر احمد علوی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز گرچہ روایتی انداز میں شاعری سے کیا جس میں ان کی دو کتابیں ''رقص لمحات'' اور ''لمحوں کی خوشبو'' ہیں۔ لیکن ان کا خاص میدان تحقیق وتدوین ہے۔ جس میں انھوں نے ایک منفرد شناخت قائم کی اور ادبی حلقوں میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔

تحقیق وتدوین سے متعلق ان کا اہم کام ''کلیات ذوق''، ''کلیات شاہ نصیر''، ''انتخاب دواوین امام بخش صہبائی''، ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق''، ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی''، ''سفر ناموں میں دہلی'' اور ''اصول تحقیق وترتیب متن'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تنویر احمد علوی کی تحقیق وتدوین کے حوالے سے بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ایک مختصر مقالے میں ان کے تمام تحقیقی کارناموں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں نے اپنے مقالے کو ان کی تین کتابوں کی حد بندی تک محدود رکھا ہے جو حسب ذیل ہیں۔ ''انتخاب ذوق''، ''انتخاب دواوین امام بخش صہبائی'' اور ''اصول تحقیق وترتیب متن'' ہیں۔

انتخاب ذوق:

تنویر احمد علوی کی تحقیق وترتیبی کام میں ایک کارنامہ ''انتخاب ذوق'' کی تصحیح وترتیب ہے۔ تنویر احمد علوی سے قبل ذوق کے کلام کو متعدد محققین نے ترتیب دیا جس میں محمد حسین آزاد، اسلم پرویز، مخمور سعیدی، انوار الحسن، برج موہن دتاتریہ کیفی، کالی داس گپتا رضا وغیرہ اہم ہیں مگر اس ذیل میں تنویر احمد علوی کا کام منفرد ہے۔ اس کتاب کے طویل مقدمے میں کلام ذوق سے متعلق تمام مستند ماخذوں، حوالوں، مولانا محمد حسین آزاد کے اضافوں اور بہادر شاہ ظفر کو پیش کیے جانے والے اشعار کے حوالے سے تحقیق وتنقید کی روشنی میں مدلل گفتگو کی گئی ہے اور کلام ذوق سے متعلق بہت

سے نئے در وا کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں کتاب کے ایک حصہ میں تفصیلی حواشیوں اور تعلیقات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے تنویر احمد علوی کا یہ کام نہایت اہم ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تنویر احمد علوی کی پی ایچ۔ ڈی کا موضوع بھی ''ذوق سوانح اور انتقاد'' تھا۔ جس کے مواد کے لیے انھوں نے طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں، یہاں تک کہ لاہور کا سفر بھی کیا جس سے تحقیق کے میدان میں ان کے ذوق وشوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے پوری دیانت داری سے تحقیق کا حق ادا کیا۔

میرے پیش نظر ''انتخاب ذوق'' کا ستمبر 1972 کا ایڈیشن ہے۔ جس میں تعارف کے تحت تنویر احمد علوی نے گیارہ صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں ذوق سے متعلق تمام اہم معلومات اور کلام کو مجتمع کیا گیا ہے۔ مرتب نے اس کتاب میں ذوق کی اہم غزلوں اور قطعات کو شامل کرنے کے ساتھ ذوق سے متعلق تمام اہم معلومات کو بھی یکجا کیا۔ اس سلسلے میں ذوق کی ابتدائی زندگی، شاہ نصیر اور غالب سے ان کی معاصرانہ چشمک، دربار سے ان کی وابستگی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ تنویر احمد علوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ذوق کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ادبی ماحول اور معاصرین کا ذکر بھی تفصیل سے کیا جس سے نہ صرف ذوق فہمی کے نئے در وا ہوتے ہیں بلکہ ذوق کی شاعرانہ خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ذوق کی شاعرانہ حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے تنویر احمد علوی لکھتے ہیں:

> ''ذوق کی شاعری آج مقبول نہیں اور موجودہ زمانے کے مزاج اور ادبی مذاق کے اعتبار سے اس میں کشش کے عناصر بہت کم ہیں لیکن وہ ہماری کلاسکل شاعری کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے۔ خاص طور سے ان کے قصائد جو ان کے کمال فن کا بہترین ثبوت ہیں ان کی علمی فضا، ان کا فکری ماحول، بے رخنہ بندش، الفاظ اور استادانہ اسلوب ادا، ان کے اردو قصائد کو اردو کے مدحیاتی ادب میں عہد کی قدیمانہ فضا، کلاسیکل طرز فکر اور ماضی سے وابستہ تہذیبی اقدار کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عظمت کا پہلو ایک عظیم دور کی عظیم روایت سے وابستہ ہے۔ جسے ان کے قصائد میں دیکھا جا سکتا ہے۔''

تنویر احمد علوی نے اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ذوق اپنی شاعری میں تکلف وتصنع، نادر تشبیہات واستعارات، مشکل زبان ومحاورہ کا استعمال کرتے ہیں جب کہ موجودہ عہد میں آسان فہم زمین میں شعر کہنے کا رواج قائم ہے۔ ساتھ ہی اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ ان کا پر تکلف انداز تحریر نہ صرف اس عہد کا تقاضہ تھا بلکہ فن قصیدہ گوئی کے لیے لازمی بھی تھا۔ ذوق کی شاعرانہ خوبیوں کے ذکر کے باب میں فرماتے ہیں کہ:

> ''ان کی شاعری میں تخیل کی پروازی اور لفظ کی جادوگری ہے۔ ذوق مختلف اسلوب اور ردیف وقوافی کے ذریعے نئے نئے مضامین بھی پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے ساتھ شاعرانہ تصورات، روحانی کوائف، عکس گیری اور زندگی کے محاکاتی پہلوؤں کی نمائندگی بھی ان کی شاعری میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔''

انتخاب دواوین امام بخش صہبائی:

یہ کتاب 369 صفحات پر مشتمل ہے، جس کو تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمے کے ساتھ ترتیب دے کر 1987 میں شائع کیا۔ اس میں تنویر احمد علوی نے امام بخش صہبائی کی ابتدائی زندگی، شخصیت، معاصرین اور ان کی علمی وادبی کاوشوں پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ انتخاب دواوین امام بخش صہبائی کا تذکرہ ہے، جس میں انھوں نے بارہ شاعروں کی حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر علوی نے ان تذکروں کا تنقید جائزہ بڑی وضاحت وصراحت اور تحقیقی عرق ریزی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تذکروں کی زبان و بیان، طرز اسلوب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ امام بخش صہبائی کو اسے ترتیب دینے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا یا انھوں نے کن کن ماخذات تک رسائی حاصل کی اور کن کن طریق کار کو اپنایا ہے۔ ساتھ ہی امام بخش صہبائی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا بھی بڑے مدلل انداز میں ذکر کیا ہے۔

تنویر احمد علوی نے امام بخش صہبائی کے تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے جس اہم نکتے کی جانب ہماری توجہ مرکوز کی ہے اور حیرت کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے کہ امام بخش صہبائی نے اپنے تذکروں میں غالب کے معاصرین اور چند غیر معروف شعرا کو تو شامل کیا ہے لیکن خود غالب کو شامل نہیں کیا۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ امام بخش صہبائی نے اپنے تذکرے میں بعض شعرا کے معاملوں میں ابتدائی ماخذ کے بجائے ثانوی ماخذ پر اکتفا کیا ہے۔ شاہ نصیر سے متعلق اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایسا بھی نہیں کہ ہر شاعر کے دیوان سے براہ راست انتخاب کیا گیا ہو بعض شعرا کے اشعار اس سے پہلے دوسرے اہل تذکرہ کے یہاں شامل ہو چکے ہیں۔ شاہ نصیر اس کی نمایاں مثال ہیں

جس کے اشعار کا انتخاب ان کے کسی دیوان سے نہیں لیا گیا۔
اس کے یہ معنی ہیں کہ شاہ نصیر کا دیوان صہبائی دستیاب نہیں ہوا‘‘

تنویر احمد علوی نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ امام بخش صہبائی چوں کہ ایک فارسی داں اور مدرس تھے اور بحیثیت مدرس وہ طالب علموں کی ضرورتوں اور دشواریوں سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقدمہ میں بیان و بلاغت کے بعض ضروری مسائل کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کی ہے اور ساتھ ہی امتداد زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے حظ وانبساط حاصل کرنے کے لیے شعر کے اجزائے ترکیبی اور مختلف النوع شعر کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے اردو کے مختلف اصناف، غزل، قصیدہ، مثنوی اور عربی فارسی کی شاعری میں روایت عشق کا ذکر کرتے ہوئے امام بخش صہبائی نے لکھا ہے:

’’معلوم کیا جانا چاہیے کہ عرب میں مرد کا عشق عورتوں پر ہوتا ہے اور فارس میں مرد کا عشق غالباً اطفال پر اور کبھی عورتوں پر بھی اور فارسیوں کے اتباع سے اردو گو بھی یہی رویہ برتتے ہیں۔ اگرچہ ہندی میں عورت کا عشق مرد پر شائع ہے اور یہ امر گیت اور دوہوں سے ظاہر ہے اور ازبسکہ عربی غزلوں میں حدیث عورتوں کی ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کا نام غزل رکھا۔‘‘

مذکورہ اقتباس صہبائی کی غزل اور اس کی روایت سے متعلق ہے جس سے ان کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تنویر احمد علوی نے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ امام بخش صہبائی نے شاعری کے بحور و اوزان اور ارکان تقطیع سے متعلق بحث کی ہے۔ ڈاکٹر علوی نے اس بات کی وضاحت بھی بڑے مدلل انداز میں کی ہے کہ امام بخش صہبائی نے مقدمے کے تحریر کے وقت ’’حدائق البلاغت‘‘ کو پیش نظر رکھا ہے۔

انتخاب دواوین میں شامل شعرا میں ولی شمس اللہ، خواجہ میر درد، سودا، میر تقی میر، جرأت، میر حسن، شاہ نصیر، ممنوں، ناسخ، مول چند، ذوق، مومن خاں مومن شامل ہیں۔ تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمے میں صہبائی کے تذکروں کے علاوہ اس عہد میں رائج انتخابات سے متعلق بھی بحث کی ہے جس کو الگ الگ مصنفین نے شائع کیا جسے تذکرہ کا نام نہیں دیا گیا۔ البتہ صہبائی اور ان کے معاصرین کریم الدین کے یہاں اس کا واضح میلان دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سلسلے میں تنویر احمد علوی نے تذکرے اور انتخاب کے فرق کو واضح کیا ہے۔ تنویر احمد علوی نے تذکروں کے فن پر بحث کرتے ہوئے امام بخش صہبائی کی گرفت کی اور یہ واضح کیا کہ امام بخش صہبائی نے بہت سی جگہوں پر تساہل اور کوتاہی سے کام لیتے ہوئے اشعار پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے اور شاعر کی سوانح وسیرت، کلام کی خصوصیات اور فکر وفن پر کم توجہ مبذول کی جو تذکرے کے فنی تقاضے کے برعکس ہے۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک حوالہ دیا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

’’کسی شاعر کے کلام کا انتخاب دس بارہ صفحہ سے کم نہیں ہے ہر صفحے میں پیش اشعار ہیں۔ شعرا کے حالات بھی درج ہیں لیکن مختصر نصف صفحہ سے زیادہ کسی کے متعلق نہیں لکھا دوسرے شعرا مثلاً غالب، ذوق اور مومن جن سے صہبائی بخوبی واقف تھے ان کے متعلق بھی چند سطریں لکھی ہیں۔‘‘

تحقیق کا کام نہایت مشکل ترین اور دقت طلب ہے۔ جس میں نقطۂ نظر اور فنی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علوی نے امام بخش صہبائی کی ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ جو بحیثیت محقق قابل قبول نہیں ہے۔ امام بخش صہبائی نے بیشتر سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے احتراز کیا۔ ساتھ ہی ان کی تنقیدی رائے نہایت سرسری اور سطحی ہے۔ ولی، میر اور سودا کے متعلق کچھ ایسے بیان دیے ہیں جو درست نہیں ہیں۔ جس کی وضاحت مثالوں کے ساتھ تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمے میں پیش کی ہے۔ میر کے متعلق امام بخش صہبائی کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

’’ان کی تعریف میں زبان انسان عاجز ہے۔ ریختہ گوئی اور محاورات (کذا) شاعر بے بدل نہ تھا بلکہ ساحر تھا اس رائے کا کسی تنقیدی بصیرت سے کوئی رشتہ نہیں۔ میر حسن کے والد میر ضاحک کے ساتھ ’’ہراتی‘‘ بھی لکھا ہے جب کہ ان کا خاندان بہت پہلے ہرات سے دہلی آچکا تھا۔ ان کے واقعہ وفات سے متعلق لکھا ہے کہ فیض آباد میں انتقال ہوگیا۔‘‘

تنویر احمد علوی نے دلائل وشواہد کی روشنی میں ان غلطیوں کی بھی نشاندہی کی ہے جو ترتیب وشواہد کے لحاظ سے غلط ہے۔ دواوین میں جو اشعار شامل کیے گئے ہیں ان میں غزل کی تعداد زیادہ ہے اور قصیدہ کو بالعموم نظر انداز کیا گیا ہے جب کہ مرثیہ، معما، تضمین کو شامل ہی نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً انھوں نے سودا کی غزل گوئی کو زیادہ اہمیت دی ہے جب کہ سودا اپنی قصیدہ گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ تنویر احمد علوی نے تذکروں کے تحت قائم کیے گئے عنوانات پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔ جہاں عنوانات و اشارات کی تحریر میں بے ربطگی، تحریر ہیئت، اغلاط و کتابت کی غلطیوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہیں اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ بے شمار غلطیوں

کے باوجود اس انتخاب کی اپنی تاریخی وادبی اہمیت بھی ہے یہی وجہ ہے کہ امام بخش صہبائی کے بعض معاصرین نے اس سے استفادہ بھی کیا۔ اس سلسلے میں فرمان فتح پوری نے کریم الدین کے تذکرہ ''گلدستۂ نازنیناں'' اورانتخاب دواوین کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گلدستۂ نازنیناں کو انھوں نے صہبائی کے انتخاب دواوین کے طرز پر مرتب کیا تھا غالبًا صہبائی ہی کی تقلید میں شعرا کے حالات وانتخاب کلام کے ساتھ عروض وقواعد سے بحث کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ ایسا نہ کرسکے۔ آغاز شاعری سے متعلق بھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ انتخاب دواوین سے ماخوذ ہے۔ یہی نہیں بعض شعرا کے تراجم کا بیشتر حصہ حرف بہ حرف صہبائی کے تذکرے ہی سے لیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ صہبائی نے صرف ۱۲، ممتاز شعرا کا انتخاب کلام دیا ہے اور کریم الدین نے چند شعر نیز شاعرات کا اضافہ کرکے ان کی تعداد ستائیس کردی ہے۔''

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس کتاب کی اپنی تاریخی اہمیت ہے۔ تنویر احمد علوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیقی صلاحیت وقابلیت اور دلائل وشواہد کی روشنی میں ''انتخاب دواوین'' میں شامل اغلاط کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ امام بخش صہبائی کے مقام ومرتبے کا بھی تعین کیا ہے جس سے تنویر احمد علوی کے تنقیدی ذہن اور تحقیقی معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ نیز اردو تحقیق نگاری کو مضبوطی فراہم کرنے میں ان کے نمایاں خدمات کا اعتراف بھی یہاں شامل ہے۔

تحقیق وتدوین کے متعلق تنویر احمد علوی کا ایک اہم کام ''اصول تحقیق وترتیب متن'' بھی ہے۔ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر قمر رئیس نے سات صفحات میں قلم بند کیا ہے اور دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۷۸ء میں شائع کیا جب کہ حرف آغاز کے تحت تین صفحات پر مشتمل تنویر احمد علوی کی تحریر شامل ہے۔

مذکورہ کتاب کے پیش لفظ میں قمر رئیس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر علوی نے اس کام میں کسی کتاب کی تقلید نہیں کی نہ ہی کسی مغربی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ جب کہ تنویر احمد علوی نے بہت دیانت داری کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے جو اصول وضوابط وضع کیے ہیں وہ بہت کچھ میرے ذاتی مطالعے اور تجربے کا حصہ ہیں۔ اس میں بیشتر اچھے تحقیقی اور تدوینی نوعیت کے کاموں کے علاوہ قدیم مخطوطوں اور مطبوعہ نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے اور مختلف مواقع پر ادبی ماخذ کو سامنے رکھا گیا ہے۔ بایں ہمہ اخذ نتائج اور استنباط نظائر کے لیے جگہ جگہ قوت استقرا کا سہارا لیا گیا ہے، جو اس سلسلۂ کار کی ایک مجبوری ہے بعض انگریزی کتابوں سے بھی رجوع کیا گیا ہے مگر ان سے کوئی بڑا فائدہ اٹھانے کی نوبت نہیں آئی اس میں میری کم نظری کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔''

تنویر احمد علوی کے قول سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے باضابطہ طور پر کسی کتاب کو مدنظر رکھ کر تخلیق نہیں کیا بلکہ انھوں نے انگریزی اور دوسری کتابوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم مفکرین کے خیالات وافکار کو پیش نظر رکھا ہے۔

353 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے موضوع سے متعلق تمام اہم گوشوں اور مباحث کو حد تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ متن کی ترتیب وتدوین میں درپیش مسائل کے ساتھ ہی تحقیقی اصول وضوابط پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ متن کی ترتیب وتحقیق سے متعلق جملہ حقائق اور مسائل کو گیارہ ابواب میں تقسیم کرکے الگ الگ عنوانات قائم کیے گئے ہیں جس میں متن اور روایت متن، تالیف متن، تحقیق متن، تاریخ متن، تاریخ کتابت متن، تاریخ طباعت متن، تصحیح متن، ترتیب متن، تحشیہ متن، تعلیقات متن وغیرہ شامل ہیں۔ ہر عنوانات کے تحت دریافت ہونے والے مواد وماخذ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ اس کے تمام گوشوں اور پہلوؤں تک رسائی ہوجاتی ہے۔ اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف نے تحقیق وترتیب متن کے موضوع پر وضاحت ومنطقی طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے مدلل انداز میں سیر حاصل گفتگو کی ہے جو اس سے قبل کسی کتاب میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ تنویر احمد علوی کی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے منطقی استدلال کے ذریعے ایسے پہلوؤں کو آشکار کیا ہے جو دوسروں کے یہاں شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تحقیق اور ترتیب متن سے متعلق بہت سے پیچیدہ اور مبہم گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے بہت دقیق اور سنجیدہ مباحث کو اپنی تحقیقی عرق ریزی سے گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے متن کی تعریف، اس کی مختلف اقسام، صورتوں، مواد کی فراہمی متن کی ترتیب وتحقیق اور تاریخ سے متعلق فرداً فرداً تمام پہلوؤں پر بڑی صراحت کے ساتھ تفصیلی بحث کی ہے۔ منطقی استدلال کی روشنی میں ایسی مدلل اور جامع بحث بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق متن کے حوالے سے چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

الف: متن کی ہیئت (حدود) کا تعین

ب: الحاق و اضافات کی نشاندہی جس کے ذیل میں تصرفات کا مطالعہ بھی آتا ہے۔

ج: متن کے گم شدہ سلسلوں کی بازیافت۔

د: متن حقائق کی جستجو اور چھان بین۔

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ متن کی بازیافت ایک مشکل امر ہے جس کی حصولیابی کے لیے جن نقطۂ نظر یا زاویوں سے اقدام لیا جاسکتا ہے مصنف نے ان کو واضح کر دیا ہے۔ ساتھ ہی اس کو برتنے کے تمام ممکنہ احتیاط کی نشاندہی کی ہے۔ اس سلسلے میں متن کی ہیئت اور اس کی قسموں سے متعلق وضاحت ہو جاتی ہے۔ مصنف کا یہ انداز تحریر ان کے منطقی طریق فکر کی غمازی کرتا ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تنویر احمد علوی کو تحقیق و تدوین کے فن پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ ترتیب و تحریر کا یہ انداز ابتدا تا آخر کتاب کے تمام ابواب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر علوی چوں کہ ایک تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ تحقیق ان کی رگوں میں پیوست تھی، لہٰذا وہ ہر وقت ہر حقیقت کے پیچھے پنہاں رہنے والی حقیقتوں کے متلاشی رہے ہیں۔ اکثر ان کی نظریں ان تاریک پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں جہاں دوسروں کی نظریں کم ہی پہنچتی ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے باریک اور سنجیدہ مسائل پر نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ بہت سی نئی اصطلاحیں بھی وضع کیں اور بعض اصطلاحات کے مفاہیم کا تعین بھی کیا۔ اس سلسلے میں تنویر احمد علوی ''متنی مواقف'' کے تحت لکھتے ہیں:

''متنی مواقف میں نسخہ کے مشتملات اور شعری متون کی صورت میں مختلف اصناف سخن کا ذکر (اس موقع پر تعداد اشعار بھی اگر دے دی جائے تو بہتر ہے) غیر تصنیفی حواشی (اگر موجود ہیں) اصطلاحات، قلم زد سطور یا منسوخ اشعار بشرطیکہ ایسی کوئی صورت موجود ہو نیز زمانہ تالیف، تاریخ کتابت، تکملہ، خاتمہ، تتمہ، تعلیقات، قطعات وغیرہ میں سے جو بھی اس متن میں شامل ہو اس پر مناسب حدود کے ساتھ بحث وغیرہ امور آتے ہیں۔ مواخرالذکر اصطلاحات میں فرق معانی و مراتب ضروری ہے جس پر ہنوز مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک تکملہ و ضمیمہ یا اجزائے متن ہیں جو متن کی تکمیل کے بعد اضافے کے طور پر شامل کیے گئے ہوں۔ اس کے مقابلہ میں خاتمہ وہ اختتامی عبارت ہے جو مصنف یا مرتب نے سپرد قلم کی ہو (مطبوعہ کتب و رسائل میں خاتمہ کے عنوان سے مصححین یا ناشرین کی عبارتیں بھی ملتی ہیں جو نسخہ کی اشاعت سے متعلق بعض امور کے بارے میں ہوتی ہیں۔)

ترقیمہ نقل کرنے والے شخص کی عبارت کو کہنا چاہیے، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نسخہ کہاں اور کب نقل کیا گیا اور نقل برداری کا فرض کس نے انجام دیا اور اس کے محرکات کیا تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ترقیمہ میں یہ تمام باتیں موجود ہوں۔ تعلیقات کا اطلاق دوسری نوعیت کی عبارتوں پر ہونا چاہیے جو بعض مطبوعات یا مخطوطات کے آخر میں شامل رہتی ہیں۔''

درج بالا اقتباس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تنویر احمد علوی نے مختلف متون اور اس کے عناصر و اجزا، پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں اصطلاحات، تعلیقات، تتمہ، ترقیمہ، خاتمہ وغیرہ کے استعمال سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔ عموماً تحقیق کے لیے ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے جو عام فہم اور سادہ ہو۔ تنویر احمد علوی نے زبان کے فنی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے گنجلک اور مبہم مسائل کو بھی بڑی صراحت مدلل اور منطقی ربط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں معروضی نقطۂ نظر اور قطعیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تنویر احمد علوی میدان تحقیق میں اپنے ہم عصروں کی صف میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی تحقیق کے لیے وقف کر دی، اور پوری دیانتداری کے ساتھ تحقیق کے کاموں میں منہمک رہے۔ انھوں نے اپنے علمی و ادبی کاموں سے نہ صرف تحقیق و تدوین کے اصول و ضوابط پر مبسوط کتاب لکھی بلکہ اپنی تنقیدی آرا سے طالب علموں کو تحقیق کی راہ میں درپیش مسائل کے حل کرنے کی ہر ممکنہ ضرورت سے باخبر کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقۂ تلامذہ کی طویل فہرست ہے۔

Safina Khatoon

Research Scholar

56/17 ,Ejaaz Manzil 2nd floor,

Aggarwal Lane,

Allama Iqbal Road, Nafees Road

Batla House ,New Delhi-110025

E-mail id-khansafina28@gmail.com

Contact No-7275185723

صدف پرویز

اقبال سہیل کی مثنوی نگاری

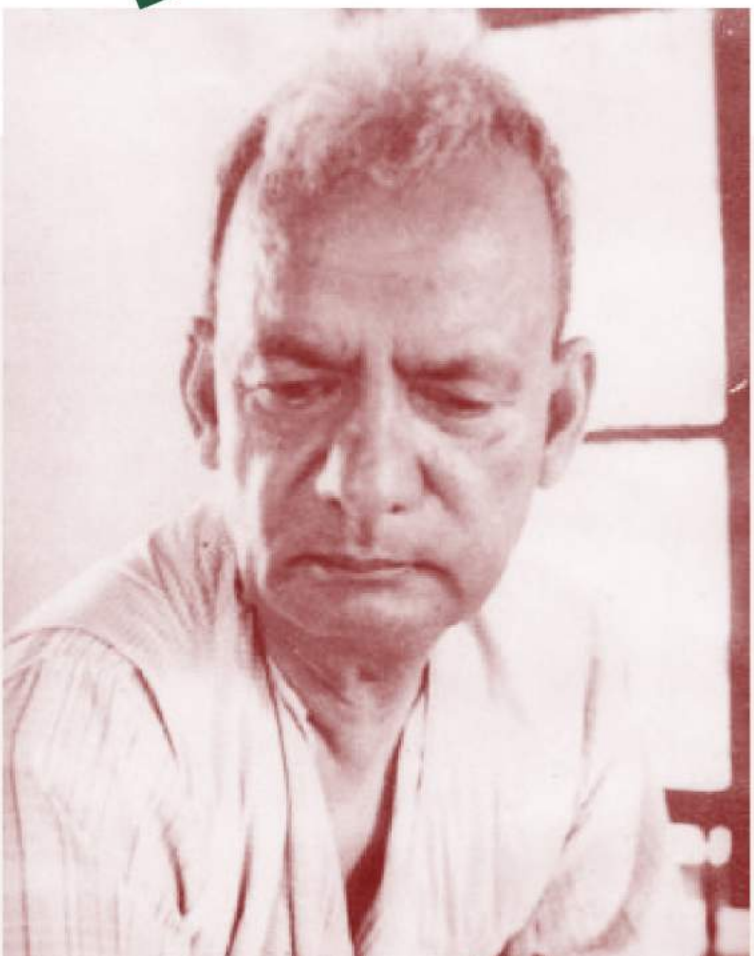

مثنوی ایک طویل مربوط نظم ہوتی ہے۔ مثنوی کے لغوی معنی ہیں۔ ''دو دو'' یا ''دو جز والی چیز'' یعنی اس کا مفہوم ہے دوہرا کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مثنوی ایک ایسی شعری تخلیق ہے جس کے اشعار کے دونوں مصرعے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ پچھلے شعر کے قافیہ سے مختلف ہوتا ہے۔ عام طور سے مثنوی کی زبان سادہ اور سلیس ہوتی ہے کیونکہ واقعہ نگاری کا تقاضہ بھی یہی ہے لیکن کبھی کبھی مثنوی یا اس کے کسی حصے کی زبان رنگین بھی ہوسکتی ہے۔ مثنوی میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ حسن و عشق کے حصے جنگ وجدل کے واقعات، پند ونصائح، فلسفہ وتصوف، مناظر قدرت غرض یہ کہ مثنوی میں کسی بھی موضوع پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے۔ ضروری نہیں مثنوی میں بیان کردہ واقعات حقائق پر مبنی ہوں لیکن ضروری ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی نظر آئیں۔ مثنوی کے لیے اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں تاریخ میں نظر آتیں ہیں۔ شبلی نعمانی نے مثنوی کے لیے حسنِ ترتیب کردار نگاری اور واقعہ نگاری کو

ضروری قرار دیا ہے۔ دکنی اور شمالی دونوں جگہ شعراء نے کچھ نہ کچھ مثنویاں لکھی ہیں۔ حالی اور آزاد نے اس صنف وسخن کو ایک سمت ورفتار عطا کی۔ ''گلزار نسیم'' اور ''زہر عشق'' اردو کی مشہور مثنویاں ہیں۔ اس کے بعد بھی بہت سی مثنویاں لکھی گئیں لیکن اتنی شہرت کسی اور مثنوی کے حصے میں نہیں آئی۔

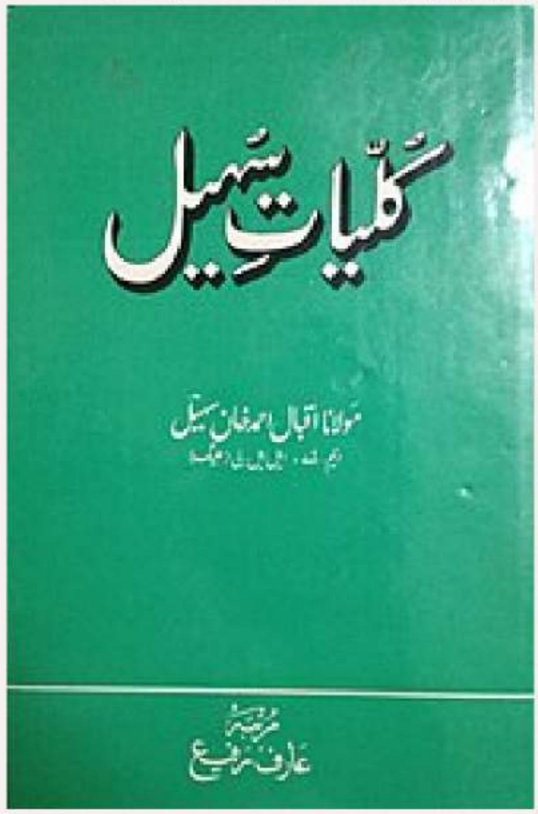

کلیات سہیل میں بھی ایک مثنوی ''حکایت ہستی'' کے نام سے شامل ہے۔ گو کہ مثنوی کا نام ''حکایت ہستی'' عربی وفارسی تراکیب سے مل کر بنا ہے۔ نام کی مناسبت سے مثنوی کے اندر بیان ہوئے واقعات کا بھی تعلق ہے۔ مثنوی کی زبان فارسی آمیز ہے۔ عربی و فارسی تراکیب کی فراوانی ہے۔ قرآنی آیات کا جا بجا استعمال کیا گیا ہے۔ مثنوی میں 186 اشعار اور 6 بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال سہیل نے فلسفہ حیات سے بحث کی ہے۔ دوسرے بند میں تخلیق آدم کا قصہ نظم کیا ہے۔ اگلے چاروں بندوں میں حضور اقدس اور خلفائے راشدین کی نعت ومنقبت بیان کی گئی ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اقبال سہیل نے اپنے ایک نظریہ کی تکمیل کی ہے جو اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''دنیا کی کوئی قوم اپنی تاریخ اور اسلاف کے کارنامے ہائے فخر سے بے نیاز نہیں رہ سکتی، کسی قوم کا ادب ہو، اس وقت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ جب تک وہ تاریخی روایات کا حامل رہے یا فلسفہ حیات کی عقدہ کشائی کرے۔ یہی راز ہے جس کی بنا پر ایران کے اتنے بڑے ذخیرہ شاعری میں صرف تین مثنویاں زندہ رہ گئی ہیں، حکیم سنائی کا ''حدیقہ''، ''مولانا روم کی مثنوی'' اور فردوسی کا ''شاہنامہ''۔ کیونکہ اول الذکر مثنویاں معارف ایمانی سے مالا مال ہیں اور فردوسی کی مثنوی درحقیقت ایرانی قوم کی رجز خوانی ہے۔ مسلمان بھی اگر زندہ رہنا چاہتا ہے تو اسے خیر القرون کے عہد زریں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھنی چاہئے اور ان کے اسلاف گرامی کے ذکرِ خیر کو وظیفہ شام وسحر بنالینا چاہئے۔ جن کی مقدس ذاتیں اسلام کے قصرِ رفعت کی ابتدائی بنیادیں ہیں۔''

اقبال سہیل کی مثنوی انھیں خیالات کی تعبیر ہے۔ انھوں نے پہلے بند میں فلسفہ حیات و کائنات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع سے ہی بزم شہود موجود تھی لیکن دنیا میں کوئی ٹھوس نظام کارفرما نہیں تھا۔ چونکہ اس وقت تک حسن مطلق کو اپنی جلوہ آرائی مقصود نہیں تھی۔ چوتھے شعر میں تلمیح ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس وقت تک خدائے برتر حضرت یوسفؑ کی خوبصورتی اور کوہِ طور پر اپنی شانِ تمکنت سے بے نیاز تھا۔ تمام تر انوار بحر تجلّی میں پیوست تھے۔ اس وقت دنیا کو نہ گردشِ ایام کی پرواہ تھی، نہ ہی صبح وشام کا نظام بنا تھا، الغرض اس وقت تک نہ تو سورج کی کرنوں کا رقص تھا اور نہ ہی موجوں میں ترنم تھا، شبنم اور پھولوں میں تبسم کچھ بھی نہیں تھا۔ یکا یک پھر ایک دن بحر ناپیدا کنار کو جوش آیا۔ اس نے انسانوں کی تخلیق کی بنا رکھی۔ اس پورے بند میں خوبصورت تشبیہات، جدت استعارات اور حسن تراکیب کی کارفرمائی ہے۔ صبح کی روشنی اور شام کی تاریکی کو صبح کا روئے روشن اور زلف شام کہنا طرز ادا کی ایک لطیف مثال ہے۔ اس کے علاوہ پورے بند میں نگاہِ برق پاش، اشکِ شبنم، پھولوں کا تبسم، کرن کا رقص، موجوں کا ترنم جیسے الفاظ و تراکیب نغمگی اور گنگناہٹ پیدا کرتے ہیں۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

جب ازل میں یہ جہانِ رنگ و بو پیدا نہ تھا
حسنِ وحدت جلوۂ کثرت سے جب بیگانہ تھا

پردۂ ایوانِ وحدت میں نہ تھا جب ارتعاش
بزمِ لاہوتی سے آتی تھی صدائے دور باش

یوسفستاں کو نہ تھی آئینہ خانہ کی تلاش
طور دل سے بے خبر تھی وہ نگاہِ برق پاش

دوسرے بند میں اقبال سہیل نے پیکر خاکی یعنی اشرف المخلوقات کی تخلیق کو موضوع بحث بنایا ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع ''بسکہ صہبائے تجلّی تھی بہت مینا گداز'' میں انھوں نے حسن مطلق کی تصویر کشی کی ہے۔ چونکہ خدا کے وجود کی آگہی فہم انسانی سے ماورا ہے۔ لہٰذا نور تجلّی کو مینا کی گدازی سے تشبیہ بالکل برمحل معلوم ہوتی ہے اور ایک بلیغ فلسفہ کی ترسیل انسانی عقل تک آسانی سے ہوجاتی ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے اقبال سہیل کہتے ہیں کہ چونکہ خدا کو اب اپنی جلوہ آرائی کی طلب ہوئی۔ اس لیے اس نے پیکر انسانی کو وجود بخشا۔ اس کے بعد ملائکِ بالا کو سجدہ تعظیم بجالانے کو کہا گیا۔ ابلیس نے انکار کردیا۔ اس کے بعد آدم کے سامنے دو راستے رکھے گئے۔ ایک شجرِ ممنوعہ سے پرہیز کرتے ہوئے جنت کی عیش پسند زندگی، دوسری دنیا کی سعی و جستجو۔ ان میں جس راستے کا چاہے انتخاب کرے۔ چونکہ سرشتِ انسانی کا تقاضہ محنت و مشقت ہے اس لیے اس نے آرام طلبی اور عیش کوشی کو نظر انداز کیا اور اپنے لیے جہدِ زندگانی کے راستے کا انتخاب کیا۔ یہاں پر اقبال سہیل نے حسنِ تعلیل کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

شجرۂ ممنوعہ کیا ہے ، گنجِ سرِ کائنات
اس کو چھیڑا اور لازم آگئی رزمِ حیات

یا جناں میں رہ کے عیشِ جاودانی کیجیے
ورنہ دنیا میں جہادِ زندگانی کیجیے

رندِ وحدت کو بھلا کب تاب تھی پرہیز کی
اور بھی منعِ شجر نے تشنہ کامی تیز کی

منتخب کر لی دلِ بے باک نے راہِ عمل
عقدۂ رمزِ خلافت کردیا ہمت نے حل

واقعہ مشہور ہے کہ آدمؑ ایک گناہ کی سزا میں جنت سے نکالے گئے تھے۔ اقبال سہیل نے اس واقعہ کو اپنی ندرت خیال سے شاعری کے حسین پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ انسان کے لیے ''رندِ وحدت'' کا استعارہ بھی معنویت سے لبریز ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ چونکہ آدم نے دنیا کی زندگی پسند کی اس لیے عالمِ افلاک پر اس کی خوشی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی۔ کیونکہ اب وہ وقت آپہنچا تھا، جب ایوانِ وحدت کے تمام راز منکشف ہوتے اور آدمِ خاکی کو کرمنا کے شرف سے نوازا جاتا۔ سورہ نبی اسرائیل کی آیت ہے،''وَ لَقَد کرَّمنا بَنی آدم ''[۳۸] یعنی ہم نے آدم کی اولاد کو عزت سے نوازا ہے۔ یعنی کہ انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف عطا کیا۔ یہ شعر اسی آیت کی ترجمانی ہے۔ یہاں سے اقبال سہیل کا روئے سخن حضور اقدس کی طرف مڑتا ہے۔

تیسرے بند میں اقبال سہیل نے بعثت نبویؐ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا جو انھوں نے حرم میں مانگی تھی کہ ''اے خدا میری اولاد میں بعض کو ایسا پیدا کر جو تیرے گھر کی عبادت و ریاضت کریں'' خدائے برتر نے ان کی دعا کو پیکر محمدؐ کی شکل میں ڈھال دیا اور اس دنیا کو نور سے معمور کردیا اور یہ نور خود خدا کا نور تھا۔ جس کی تجلّی مختلف آئینوں سے چھن کر انسانی روپ میں ظاہر ہوئی۔ آگے کے اشعار میں نور محمدی میں نورِ مطلق کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ عبدیت اور معبودیت کا حق بھی ادا ہوجاتا ہے اور دونوں کے بیچ گہری وابستگی کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

گرچہ سب آساں تھا صانعِ حقیقی کے لیے
ہم کہاں پاتے نظرتابِ تجلّی کے لیے

اس لیے حکمت کا منشا تھا کہ انوارِ قدم
چند آئینوں سے چھن کر ہوں ضیا بارِ کرم

ایک تو بے واسطہ ہو نورِ حق کا انعکاس
دوسرے آئینہ اول سے لے کر اقتباس

رہ نہ جائے کچھ تفاوت اصل اور تصویر میں
فرق اگر کچھ ہو تو نطق وحی کی تقریر میں

یہیں سے اقبال سہیل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں سے دو شعر کے بعد براہِ راست چوتھا بند شروع ہوجاتا ہے۔ اس میں انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو مستند قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ حضورؐ جس کے مقتدی بنے ہوں اس کی خلافت کا انکار سراسر ایمان کی کمزوری ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت کے تمام امور جیسے مجلس شوریٰ کی تنظیم، فتنہ ارتداد، انکار زکوٰۃ وغیرہ کا بیان واقعہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

پانچواں بند حضرت عمر فاروقؓ کی منقبت ہے۔ فاروقِ اعظم کو اقبال سہیل نے حضورؐ اور صدیق اکبرؓ کے انوار کا مجموعہ کہا ہے۔ اقبال سہیل

نے اس بند میں دورِ فاروقیؓ میں ہوئی فتوحات، ان کا رعب ودبدبہ اور منکسر المزاجی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔اس کے بعد کہا ہے کہ صدیق اکبرؓ جس طرح حضورؐ کے غار کے ساتھی تھے۔عمر فاروق اسی طرح کفار کے ایزا رسانیوں اور حضورؐ کے بیچ شدت کی دیوار کی مانند تھے۔اسی خیال کو انھوں نے آیت قرآنی سے اٹھایا ہے اور اشعار میں قرآنی آیات اس طرح جڑ دی ہیں کہ یہ اسی شعر کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ملاحظہ ہو:

آئینہ دار معیت اذھُمَا فِی الغَار ہے
شانِ فاروقیؓ اَشِدّاءُ عَلَی اَلکُفّار ہے

دونوں تفسیرِ تَرکتُ فِیکُم الثَقلیَن ہیں
آج بھی دونوں رفیقِ سیہ الکونینؐ ہیں

چھٹے بند میں حضرت عثمانؓ اور حضر علیؓ کی مدح اور چاروں صحابۂ کرام کی خلافت کو برحق بتایا گیا ہے۔حضرت عثمانؓ کے بیان میں اقبال سہیل نے ان کے انتخاب کے مراحل، ان کے عہد میں ہونے والی ملیّ ترقیوں اور انؓ کے حلم ومروت کا ضمناً ذکر کیا ہے۔اس کے بعد آخری وقت میں انتقال کی اجازت نہ دینا، شہادت کا جام پی جانا، اور خون کے چھینٹوں کا صفحۂ قرآن پر پڑ جانے جیسے واقعات کو بھی شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔آگے بڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اسلامی حکومت کا پہلا واقعہ تھا جب جامِ شہادت خود مسلمانوں کے ہاتھوں ملا تھا اور یہیں سے اسلامی سیاست کا زوال شروع ہوا تھا۔اس کے بعد حضرت علیؓ کی خلافت کا ذکر کرتے ہیں کہ اسی فتنہ کے ماحول میں کس طرح حضرت علیؓ کا انتخاب ہوا یہاں تک کہ جنگ جمل اور جنگِ صفین جیسی جنگوں کی نوبت آجاتی ہے۔لیکن اس کی وجہ سے ملّت کی دینی وحدت میں فرق نہیں پڑتا۔مثنوی کے آخر میں اقبال سہیل کا فکری نظریہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔اقبال سہیل آخیر میں کہتے ہیں جس طرح ارکان اسلامی چار (نماز، روزہ حج، زکوٰۃ) ہیں۔اسی طرح حضورؐ کے بعد خلفائے اربع پر ایمان واتفاق بھی ایمان کی تکمیل کا لازمی جز ہے۔مثنوی کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

بعدِ ایماں جس طرح ارکانِ اسلامی ہیں چار
یونہی بعداز مصطفٰےؐ توحید کے حامی ہیں چار

نطقِ ربّانی کے اذعانی مفسّر چار ہیں
جسمِ ایمانی کے روحانی عناصر چار ہیں

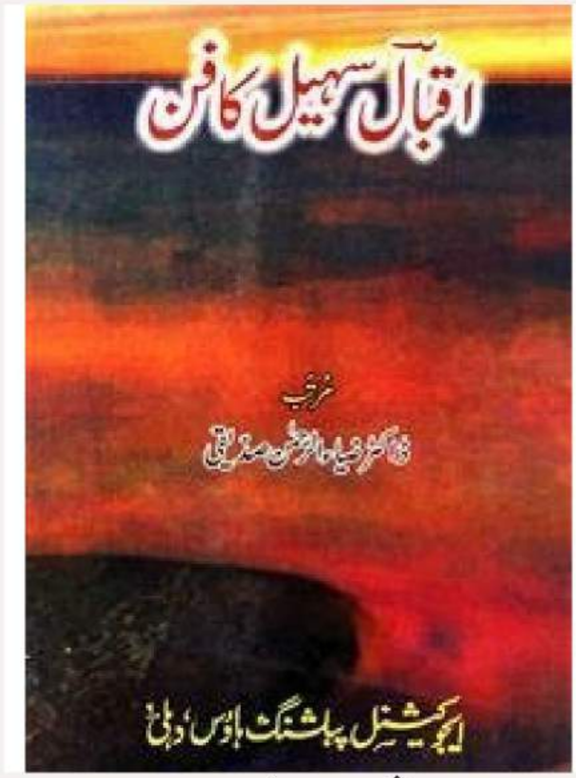

تو تیائے چشمِ عرفاں خاکِ پائے چار یار
سچ تو یہ ہے شرطِ ایماں ہے ولائے چار یار

مثنوی کا طرز ادا حکیمانہ اور وضاحتی ہے عربی وفارسی کی ترکیب کی فراوانی اور آیاتِ قرآنی کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔تخیلّ کی رنگ آمیزی اور صناعی کی بہ نسبت حقیقت نگاری کا اصول کارفرما ہے۔الفاظ کی مناسب ترتیب اور بندش کی چستی سے مثنوی کامیاب ہے۔موضوع کی مناسبت سے پرشکوہ اور پروقار الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔کہیں کہیں تلمیحات کے سہارے سے اپنی بات کی وضاحت کی گئی ہے۔جیسے ایک جگہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا ذکر کرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ جس طرح حضرت یحییٰؑ کے قتل کا وبال ان کی قوم پر آیا تھا۔اسی طرح خونِ عثمانی کا وبال ملّت اسلامی پر پڑا۔

خون عثمانی ہو اسلامی سیاست کا زوال
خون یحییٰؑ کی طرح ملّت پہ ہو اس کا وبال

□□□

Sadaf Parvez
M41A, Batla House
Jamia Nagar
New Delhi-110025

ڈاکٹر شازیہ اشرف

طنز و مزاح نگار خواتین

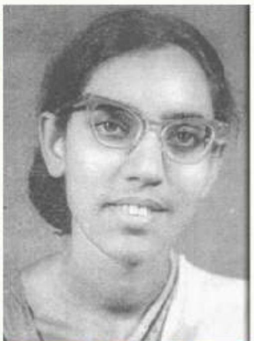

اُردو ادب میں طنز و مزاح کو عموماً یکساں معنوں میں لیا اور ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے حالاں کہ طنز و مزاح میں فرق ہے دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں۔لیکن اس کے باوجود اکثر ایک دوسرے کے متوازی بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ایسے ملی ہوتی ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔طنز و مزاح کے بارے میں مشتاق احمد ورک یوں رقم طراز ہیں:

''مزاح نگار کسی بھی معاشرے میں محض (Entertainer) ہی نہیں بلکہ اس معاشرے کا مسیحا بھی ہوتا ہے، جس کی انگلیاں ہمیشہ اس معاشرے کی نبض پر ہوتی ہیں اور دل اس کے نشیب و فراز کے ساتھ دھڑکتا ہے۔''

(ڈاکٹر مشتاق احمد ورک، اردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت لاہور، 2004، ص،20)

طنز سے مراد طعنہ، ٹھیٹھڑ، تمسخر، یا رمز کے ساتھ بات کرنا، جب کہ مزاح سے مراد خوش طبعی، مذاق، ظرافت مراد لیا جاتا ہے۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جو تحریریں ہنسنے پر مجبور کریں لیکن ان تحریروں میں تنقید کو مزاح کا جامہ پہنا دیا جائے تو اسے طنز و مزاح کہتے ہیں۔ڈاکٹر طاہر تونسوی نے طنز و مزاح کے بارے میں خوب صورت بات کہی ہے:

''طنز و مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں ہے۔یہ گہرے عرفانِ ذات اور معاشرہ کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، مشمولہ، طنز و مزاح، تاریخ تنقید، انتخاب مرتب ڈاکٹر طاہر تونسوی، ص،129)

طنز اور مزاح کا الگ الگ جائزہ لینے پر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے محرکات کے اسباب میں بڑی حد تک مماثلت ہے لیکن ردِ عمل کے لحاظ سے دونوں میں واضح فرق ہے طنز ناہمواریوں کے بے باکانہ، سفاکانہ اور محتاط انداز میں کہا جائے تو حقیقت پسندانہ شعور و احساس کا نتیجہ ہوتا ہے اور مزاح آزادانہ فکر اور ہمدردانہ شعور و احساس کے ایک باہمی ردِ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔طنز سے قطع نظر جہاں تک مزاح کا تعلق ہے مزاح میں بھی زود ِ ہنسی اور ظریفانہ مزاج کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن یہ طنز کے برعکس ایک قسم کی خوشگوار ذہنی رویے یا شگفتہ اور شائستہ ذہنی و فکری رجحان کا رہین منت ہوتا ہے۔مزاح کی تحریر بھی طنز و ہجو کی طرح ناہمواریوں بے ڈھنگے پن زندگی کے ابتر حالات اور مضحکہ خیز معاملات کے شعور و احساس سے ہوتی ہے لیکن ردِ عمل کے طور پر مزاح میں طنز کی طرح باہمی یا ہجو کی حقارت کے بجائے ہمدردی اور انبساط کی کیفیت غالب ہوتی ہے اور اس کا اصل مقصد حصول مسرت ہوتا ہے۔مزاح کے سلسلے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری تحریر کرتے ہیں:

”مزاح زندگی کے غیر متناسب اور بے جوڑ مظاہرے کو نمایاں کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔“

(رشید احمد صدیقی بحیثیت مزاح نگار، رشید احمد صدیقی کردار، گفتار، مرتب مالک رام، ص113)

ظرافت کے لغوی معنی دانائی اور خوش طبعی ہیں۔ فرائڈ نے اسی عمل کو sense in non sense کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اعلیٰ درجے کا مزاح اور فکری سنجیدگی لازم و ملزوم ہیں۔ جس مزاح میں تفکر کا عنصر مفقود ہو وہ سوقیانہ اور سطحی گردانا جاتا ہے۔ معیاری ظرافت، مسرت بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ سوچنے اور غور و فکر کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ یوں بھی وہی فن آفاقیت کی حدوں کو چھوتا ہے جس میں دل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی شامل ہوتا ہے۔

طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش اٹھارہویں صدی میں مرزا محمد جعفر زٹلی کے کلام میں ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں انسانی قدروں کی پامالی اور معاشرے کی ناہمواریوں پر طنز کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ داستانوں اور مثنویوں میں بھی ایسے جز ملتے ہیں جنھیں اردو طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس روایت کو بعد میں سودا انشاء اور نظیر اکبرآبادی نے پروان چڑھایا لیکن اردو طنز و مزاح کی روایت میں استحکام غدر 1857 کے بعد کے زمانے میں حاصل ہونا شروع ہوا خصوصاً مرزا غالب کے خطوط اردو نثر میں طنز و مزاح کی اعلیٰ نمونے مانے جاتے ہیں۔ غالبہ نے اپنے خطوط میں طنز و ظرافت کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد اودھ پنچ کے لکھنے والوں کی تخلیقات میں طنز و مزاح میں نہ صرف ہمہ گیری وسعت و تنوع اور گہرائی پیدا ہوئی بلکہ اسے اعتبار بھی بخشا اور خاص طرزِ اظہار کے طور پر اس کے فروغ کے لیے راہ ہموار۔ اودھ پنچ کے طنز و مزاح میں ہر طرح کے اسالیب اور معیار ملتے ہیں نہایت شائستہ اور شگفتہ طنز کی مثالیں بھی ہیں اور پھکڑ پن کے نمونے بھی، مغربی تہذیب کا مذاق بھی شدومد سے اڑایا گیا ہے اور لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کو بھی حدف کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں سب سے بڑا نام رتن ناتھ سرشار کا ہے انھوں نے اپنے ناولوں میں طنز و مزاح کو بخوبی پیش کیا ہے جس کی عمدہ مثال فسانہ ٔ آزاد کا کردار خوجی کا ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں جن کا نام قابل ذکر ہے وہ کچھ اس طرح ہیں، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ۔

جہاں خواتین قلم کاروں نے اردو ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی وہی طنز و مزاح میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں خواتین قلم کار پیش پیش رہیں۔ خواتین کی مزاحیہ تحریریں شاعری کے علاوہ نثر میں کہی اصناف میں جزوی و کلی طور پر پیش ہے جن میں مزاحیہ مضامین انشائیہ مزاحیہ افسانے، ڈرامے، ناول، کالم، ادب اطفال، سفرنامے، رپوتاژ، خطوط اور خاکے وغیرہ شامل ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب یا ہلکے پھلکے انشائیوں کے نمونے خال خال ہی صحیح پہلی بار خواتین دکن کے یہاں ملتے ہیں۔ آصف جہاں کے مضامین کا مجموعہ ”گلِ خنداں“ اس قسم کی پہلی کوشش ہے۔ آصف جہاں فرحت اللہ بیگ کی بھانجی ہیں اور فرحت اللہ بیگ نے ہی اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ ”گلِ خنداں“ کے مضامین کے موضوعات گھریلو واقعات ہیں جس کے اظہار کے لیے افسانے کی تکنیک نہ استعمال کرتے ہوئے مضمون نویسی کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اسے یوں تو طنز یا مزاح کے دائرے میں کھینچ لانا مشکل ہے لیکن مزاح کی دنیا میں خواتین کا پہلا قدم ہے۔ معیار اگر چہ کم ہے لیکن طنزیہ و مزاحیہ ادب میں خواتین کے سفر کی یہیں سے ابتدا ہوئی ہے۔ حیدرآباد کی ہی صالحہ بیگم اور وجی النساء ماہ جبین نے بھی یہی رنگ اختیار کیا ہے۔ اسی دور میں شہناز بیگم کی شعری تخلیقات سامنے آئی جن پر اکبرالہ آبادی کا رنگ غالب ہے۔ شاہین اور قیصری احمد اسی زمانے میں انشائیہ نگاری سے دلچسپی لیتی نظر آتی ہیں ان کے مضامین رسائل و اخبارات میں گاہے گاہے چھپتے رہے لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ حجاب امتیاز علی، خاتون اکرام، آنیہ محمود، رضویہ اور وحیدہ نسیم کو بھی اس صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جہاں بانو نقوی کی ہم عصر صالحہ عابد حسین نے بھی ریڈیو کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں مضامین لکھے ہیں۔ وہیں شاتت ہمسایہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری بھی کی ہے جس میں طنز کے نشتر ہیں:

نامکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور
چوڑیوں کا بھی اضافہ ہونا چاہیے

افسانہ ناول اور ڈراموں میں طنز و مزاح کو خوب صورت انداز میں جگہ دینے والی مصنفاؤں میں پہلا اور اہم نام عصمت چغتائی کا ہے ان کا شاہکار ناول اس کی اچھی مثال ہے۔ ناولٹ معصومہ اور بزدل میں بھی یہ رنگ حاوی ہے۔ طنز و مزاح کو اس کے اصل روپ یعنی مختصر مضامین میں پیش کرنے میں تین خواتین کے نام سرفہرست ہیں جو تقریباً ایک عرصے سے لکھ رہی ہیں۔ ان میں سلمہ صدیقی، سرور جمال، اور شفیقہ فرحت کے نام اہمیت کے حامل ہیں سلمہ صدیقی رشید احمد صدیقی کی بیٹی اور کرشن چندر کی بیوی ہیں دونوں اپنے اپنے عہد اور اپنے اپنے رنگ کے منفرد یافتہ مزاح نگار تھے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہے کہ سلمہٰ صدیقی کو طنز و مزاح وراثت میں ملا ان کی ایک مزاحیہ تحریر ”سکندر نامہ“ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ان کے

باورچی ''سکندر'' کی مضحکہ خیز حرکتوں کی داستان ہے۔ سرور جمال کے طنزو مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ''مشقِ ستم'' اور ''مفت کے مشورے'' شائع ہو چکے ہیں۔ سرور جمال کے یہاں طنز کا عنصر کم ہے ان کا کینوس گھریلو زندگی اور آس پاس کی دنیا تک ہی محدود ہے لیکن انداز بیان کی شگفتگی اور روانی قاری کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔

خالص طنزومزاحیہ مضامین پر مشتمل شفیقہ فرحت کے تین مجموعے ''لوآج ہم بھی''، راںگ نمبر'' اور گول مال'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ کرکٹ سے کرسی تک زندگی کے تمام مسائل ان میں سموئے گئے ہیں۔ یعنی تفریح سے سماج اور سیاست تک ان کی نظر پہنچی ہے۔ شفیقہ فرحت کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

'' اردو کی واحد خاتون ہے جنھوں نے طنز ومزاح کو بطور صنفِ سخن اپنایا اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ برسوں سے لکھ رہی ہے انہیں سب جانتے پہچانتے ہیں ان کے بارے میں میری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے۔''

(بحوالہ ٹیڑھا قلم، ص،4)

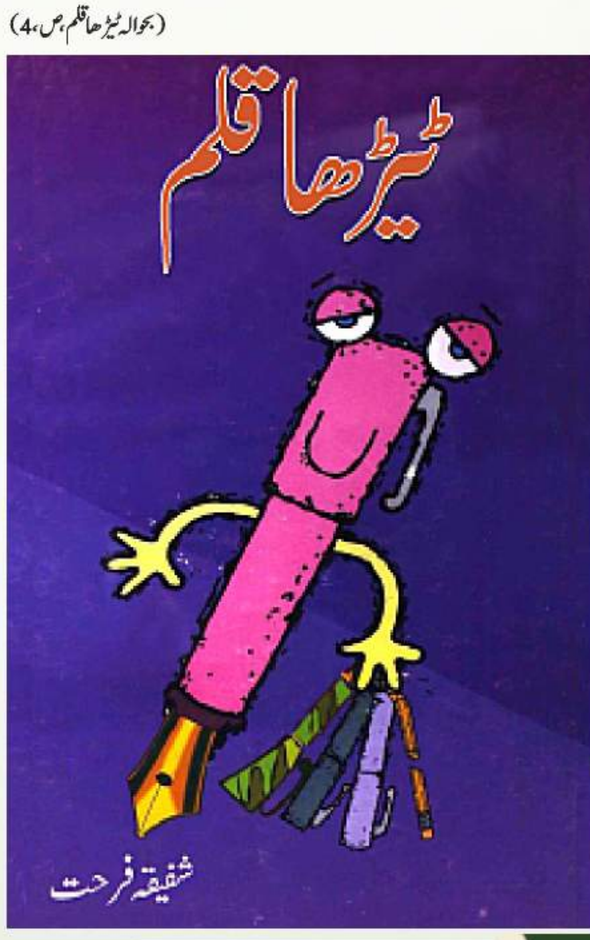

اس کے علاوہ اس میدان میں جو اہم نام سامنے آتا ہے وہ ڈاکٹر حبیب ضیاء کا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 1981 میں ''زندہ دلان'' حیدرآباد سے شائع ہوا جو پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ رشید موسوی، بانو نقوی، رشیدہ قاضی، فاطمہ تاج، نسیمہ تراب الحسن وغیرہ س ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ طنزومزاح کے میدان میں خواتین قلم کاروں نے بیش بہا اضافہ کیا اور اس صنف کے ساتھ انصاف بھی کیا۔

آصف جہاں نے اپنے مضامین میں طنزومزاح کے انداز میں ان موضوعات اور واقعات کو پیش کیا ہے جن سے کہیں نہ کہیں ہمیں روز واسطہ پڑتا ہے۔ ہماری ضروریات زندگی میں ہمیں جن لوگوں، مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان میں آصف جہاں نے اپنے طنزیہ مضمون ''گناہ دروغ بر گردن'' میں ملازموں کی نفسیات اور ان کے نخروں کو بڑے خوب صورت اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:

'' صبح گھر سے خالی ہاتھ آتی ہے شام کولدی پھندی جاتی ہے سالن کا گھی اتار کر پی جاتی ہے اور سالن کی بوٹیاں پکاتے وقت چٹ کر جاتی ہے ۔۔۔۔ اگر کبھی غلطی سے میم صاحبہ پوچھ بیٹھتی ہے تو یہ کہہ کر خاموش کر دیتا ہے۔ کہ میں کوئی نیا نہیں ہوں یعنی سودا لانے بارہ بارہ چوبیں برس گزر گئے کوئی ننھا بچہ تو نہیں کہ بغیر پوچھے گچھے سودا لاؤں''

(گل خنداں، ''گناہ دروغ بر گردن'' ص،29)

آصف جہاں کے یہاں فرسودہ اور توہم پرستی کے خلاف جنگ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے طنزومزاح میں توہم پرستی کے خلاف بغاوت دیکھنے کو ملتی ہے اس لیے اپنی ملازمہ کے ذہن کے ذریعے سماج کی فرسودگی اور توہم پرستی کی صدیوں پرانی فکر کو یوں توڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں:

آصف جہاں جب اپنی ملازمہ بی مغلانی (چاند بی) کی بات کرتی ہیں تو اللہ سے دعا کرتی ہیں کہ یا اللہ چاند بی کو بیسویں صدی میں زندہ کیوں رکھا یا تو مغلانی کو اٹھا دے یا بیسویں صدی میں رہ رہے ہم کو، کیوں کہ بی مغلانی اس کی اماں جان کی جہیز میں ملی ایک پرانے خیالات کی ایک ملازمہ ہے جو بات بات پر روایتی اور توہم پرستی کی باتیں بتاتی رہتی ہے۔ سفید اور کالا رنگ پہننے نہیں دیتی جب بھی کوئی گھر میں سفید ساڑی پہننے کو نکالی تو انھوں نے دیکھتے ہی حلق پھاڑ نا شروع کر دیا۔

'' کبھی میں نے سفید ساڑی پہننے کو نکالی تو انھوں نے حلق پھاڑنا شروع کی او یے بی بی یہ کیا ہے؟ پھینکو یہ ساڑی جب تو دیکھو کالی یا سفید۔۔۔۔۔۔ تمھارے دشمن کالے اور

سفید ساڑی پہنے بیگم صاحبہ کیا آپ ڈھیلی ڈوری چھوڑ دی ہے بی بی کو ذرا نہیں بولتے تو بہ سنتے نہیں کچھ نہیں جو جی چاہیے کرواب سے کبھی نہیں بولوں گی''۔

(گل خنداں، ''گناہ دروغ برگردن'' ص 36)

جہاں بی مغلانی رنگوں کو لے کر پُرانے خیالات اور فرسودہ روایت کو سمجھاتی رہتی ہیں وہیں انھیں بیسویں صدی میں لڑکیوں کے باہر جانے، پڑھنے لکھنے اور انگریزی میں بات کرنے پر بھی اعتراض ہے۔

جو خواتین قلم کار فرسودہ اور روایت پسند معاشرتی نظام کو بدلنا چاہتی تھیں انھوں نے ترقی پسند رجحان کو اپنی تحریروں میں خوب صورت انداز میں اجاگر کیا۔ انقلابی فکر اور معاشرے کی انصاف ومساوات کے اصولوں پر تعمیر نو کی شدید خواہش ان تحریروں کا خاصہ ہے۔ آصف جہاں کے یہاں نسائی اور تانیثی فکر کی خوشبو طنز ومزاحیہ تحریرات میں رچ بس گئی ہیں۔ ان کے یہاں صنفی امتیازات کے خلاف احتجاج کی بلند لے اور مزاحمت کی دھیمی آواز گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ وہ اس فکر کے تعلق سے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''اُف خدایا! یہ بچپن بھی کتنا برا ہوتا ہے۔ جی نہیں میں نے غلط کہا۔ بچپن کا پڑھنا بہت برا ہوتا ہے۔ بھلا آپ ہی انصاف کیجیے۔ بھاگیں دوڑیں تو کہا جاتا ہے لڑکی مردانہ چالیں اختیار کر رہی ہے۔ جھوٹ موٹ کا مکان بنائیں۔ بھائیوں کے ساتھ سیر کو جانے کے لیے یا گھوڑے پر بیٹھنے کے لیے ضد کریں تو کہا جاتا ہے ''لونڈا بن کر کیوں نہ پیدا ہوئیں؟

لیکن پڑھنے کے لیے نہیں کہا جاتا کہ ''لونڈا بن کر آنا تھا'' آکر پڑھنا بھی تو لونڈوں ہی کا کام ہے۔ بھلا عورت ذات کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اُسے نوکری کرنا ہے۔''

(''بچپن''۔ ''گل خنداں''، آصف جہاں، ص، 91-90)

ان کی تحریرات اپنے عہد اور معاشرے کی سچی اور بولتی ہوئی تصویروں کا البم معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں متوسطہ گھروں کی عکاسی خوب ہوئی ہے:

''بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ بڑے تو نو نو بجے دن تک بستر پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم نے بیدار ہونے میں معمول سے ذرا بھی زیادہ دیر لگائی تو چیخ چیخ کر گھر سر پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس پر بھی اگر ہم صبر کر کے لیٹے رہے تو سرد پانی کے گلاس ہم پر انڈیلے جاتے ہیں یا پھر لحاف کھینچ کر ہم کو ''جنے'' کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے مجبور ہو کر ہم کو اٹھنا پڑتا ہے۔

ہم پوچھتے ہیں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بڑوں کو تو اجازت ہے کہ جب تک چاہیں بستر پر پڑے رہیں تو پھر آخر ہم پر یہ ظلم کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ ہم چھوٹے ہیں۔''

(گل خنداں'' ، جدوجہد'' آصف جہاں، ص 138)

آصف جہاں کی فکر اور طنز ومزاح کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی یوں رقم طراز ہیں:

''گل خنداں کے جملہ مضامین کو پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کسی مضمون میں بھی بدتمیزی یا بیہودگی نہیں ہے۔ وہ پاکیزہ مذاق اور دل نواز لطافت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بیان میں سلاست ہے۔ ان کا ہر مضمون سرور اور کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ لطافت اور بلند پائیگی کے اعلیٰ جوہر سے مزّین ہیں۔''

(گل خنداں'' ، مقدمہ از نصیر الدین ہاشمی، ص 6,7)

ان کی مزاحیہ تحریرات میں زندگی کے حالات وواقعات کو پوری سچائی اور خلوص کے ساتھ صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا گیا۔ ان کے یہاں اس

وقت کے تعلیمی نظام پر خوب طنز کیا گیا ہے جو جدید تعلیمی نظام سے کوسوں دور ہے۔

''مولوی صاحب ہمیں چھڑی سے نہیں مارا کرتے تھے بلکہ ان کے پاس ایک تسمہ تھا ویسا آج کل لڑکے بلٹ باندھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔۔۔۔
ایک دوسری خوفناک سزا جو وہ دیتے تھے یہ بھی تھی کہ پنسل انگلیوں کے بیچ میں رکھ کر اس زور سے دباتے تھے کہ بس خدا یاد آجاتا اور ساتھ ہی یہ دھمکی کہ''اگر گھر میں جا کر کہا تو انگلیاں توڑ دوں گا۔''

(گل خنداں'' بچپن' 'آصف جہاں،ص92،92)

سرور جمال ہندوستان کی نامور مزاح نگار خاتون ہیں ان کی تحریروں میں طنزومزاح کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے انھوں نے عام خواتین قلم کاروں کی روش سے ہٹ کر طنز ومزاح اور ظرافت نگاری کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا اس فن میں وہ بہت حد تک کامیاب ہوئی ہیں ان کے دو مجموعے''مشقِ ستم'' و''مفت کے مشورے''منظرعام پر آچکے ہیں مشقِ ستم'' کو یو پی اردو اکیڈیمی کے ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے ان کا دوسرا مجموعہ''مفت کے مشورے'' 1981 میں شائع ہوا۔اس میں اکیس مضامین ہیں طنزومزاح کے فن سے سرور جمال خوب واقف ہیں زبان کی سلاست و روانی کے علاوہ الفاظ کے الٹ پھیر سے ایسا مزاح پیدا کرتی ہیں کہ قاری ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی ان کی گرفت ہے۔انھوں نے جن مسائل کو اپنے طنز کا موضوع بنایا وہ ہماری زندگی سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔'مفت کے مشورے' ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں سرور جمال نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو بڑے طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے خاص کر عورتوں کے حوالے سے عورتوں کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک عورت رشتوں خاص کر میاں بیوی کے رشتے کو لے کر کیا سوچ رکھتی ہے وہ ایک مضمون''اگر میں شوہر ہوتی'' میں کچھ اس طرح سے ظاہر کرتی ہیں کہ کیسے ایک عورت جب بیوی ہوتی ہے تو شوہر کے فرض کو آسان اور خود کی ذمہ داریوں کو مشکل سمجھتی ہے ویسے ہی وہ خود کو اپنے شوہر کی جگہ رکھ کر سوچتی ہے تو اس کو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے ضروری ہیں دونوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔یہاں طنزومزاح کے دائرے میں فکر کی بالیدگی نظر آتی ہے۔

''پہلی تاریخ کو ایک فرمابردار شوہر کی مثال قائم کرتے ہوئے تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے۔۔۔تو جناب یہ ہے میرا پروگرام بس خدا ایک بار مجھے شوہر بنا دے تاکہ میں بھی فخر سے کہہ سکوں زندگی نام ہے ہنس ہنس کر جیے جانے کا''

(مفت کے مشورے'' اگر میں شوہر ہوتی''ص،83)

سرور جمال نے ہر ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔سماج میں پنپتی ہر برائی کو اپنے مضامین میں بڑی ظرافت کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر ہے وہ جو قاری کو ہنستے ہنستے سنجیدہ بھی کرتا ہے۔انسان جتنا زیادہ ماڈرن ہوتا جارہا ہے اتنا ہی وہ تباہیوں کی طرف خود کو بڑھاتا جاتا ہے۔سرور جمال نے اپنے مضامین میں قاری کو ان چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا ہے۔یہاں پر ماحولیات کی تباہی کا ذکر ہے کہ کس طرح روزانہ وجود میں آتی جا رہی ہیں جس سے ماحولیات پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔وہ اپنے ایک مضمون'' ہمارا شہر ترقی کی راہ پر'' میں لکھتی ہیں:

''کچھ ایسا اتفاق رہا ہے کہ بچپن ہی سے میں کسی نہ کسی سلسلے میں شہر سے باہر رہی لیکن جب بھی سال چھ ماہ گھر پر آئی۔۔۔بڑی عمارتیں دھرتی سینے پر مونگ دلنے آگے بڑھتی جارہی ہیں۔''

(مفت کے مشورے''ہمارا شہر ترقی کی راہ پر''ص،71)

سرور جمال کی تحریرات میں طنزومزاح کی مٹھاس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی طنزومزاح میں فکر کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ان کے یہاں گوناگوں افکار دکھائی دیتے ہیں۔شہر جب بھی ترقی کے منازل طے کرتا ہے تو ساتھ ساتھ میں ماحول اثر انداز ہو جاتا ہے۔بڑے شہروں کے ترقی یافتہ بننے سے ماحولیات کی ترقی منجمد ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔سرور جمال اپنے مضمون میں اپنے''شہر کی ترقی'' رقم کرتے کرتے ماحولیات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچ لیتی ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ شہر کی ترقی سے ماحولیات پر اثر پڑتا ہے:

''ابھی جب میں اپنے شہر کی ترقی کی داستان قلم بند کر رہی تھی، مجھے ایسا لگا گویا کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں، جو مجھ سے فریاد کر رہی ہیں، کہ ہمیں کس بناء پر نظر انداز کیا گیا، مثلاً کوڑے کچرے کے ڈھیر، سڑک کے گڑھے اور نالیاں، مچھرّوں، مکھیوں اور کھٹملوں کے حیرت انگیز طور پر بڑھتے ہوئے خاندان۔۔۔یہی مکھی، مچھر، کھٹمل، کیڑے مکوڑوں اور جراثیموں کے خاندان، ان کی کنبہ پروری، ان کی ترقی ہی کی وجہ سے تو ہو رہی ہے، نسل کشی کا گناہ کون اپنے سَر لے، ترقی کا زمانہ ہے، انھیں بھی ترقی کرنے دیجئے کیوں ان کی

ترقی شہر کی ترقی کا ایک حصہ ہے اور ہمارا شہر ترقی کر رہا ہے“

(مفت کے مشورے، ”ہمارا شہر ترقی کے راہ پر“ ص 21،22،23)

فاطمہ تاج کا نام بھی مزاح نگاری میں اہمیت کا حامل ہے انھوں نے شاعری کے علاوہ مختلف نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان کی تقریباً بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جن میں چھ شعری مجموعے ہیں۔تاج فاطمہ حیدر آباد کی کئی نسائی ادبی تنظیموں کی فعال رکن رہی ہیں اتر پردیش کی اردو اکیڈمی اور میرا اکیڈمی لکھنؤ نے ان کو اعزازات سے نوازا ہے فاطمہ تاج کے مضامین تازگی شوخی و بزلہ سنجی کا مرقع ہیں انھوں نے مزاح کو سطحی انداز میں نہیں برتا۔فاطمہ تاج کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کے موضوع پر لکھنے کی قدرت رکھتی ہیں، فاطمہ نے بڑے خنک اور شیریں انداز میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔اخبار سیاست، آج کل مضمون، اس کی بہترین مثال ہے، زبان سہل اور دل کو چھونے والی ہے۔طنز و مزاح کا ایسا استعمال کیا ہے کہ انسان ہنستے ہنستے سنجیدہ ضرور ہو جاتا ہے اور ان کی کہی بات اصل یا نفسِ مضمون کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔انسان پہلے تو سنجیدہ ہو جاتا ہے کہ شاید اب سیاست کی بات ہوگی لیکن پڑھتے پڑھتے انسان ہنس پڑتا ہے جب وہ اخبار سیاست کی بات کرتی ہیں اور اس میں انڈے، دودھ، گوشت باقی چیزوں کی قیمتوں کے بارے میں بڑے مزاحیہ انداز میں مہنگائی جیسے مسئلے پر طنز کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ اخبار کی اہمیت اور اس کے پڑھنے کے فوائد بھی گنواتی ہیں:

> ”ہم نے اپنی چہیتی لاڈلی بیٹی کی جان کے صدقے اتارتے رہنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ہم اپنے نام کی طرح صدقہ یاد رکھتے ہیں۔عمر رسیدہ بہت ہی قدامت پسند گھرانے کی خواتین ہمارے یہاں آتی رہتی ہیں ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ہم نے کئی بار اپنی بیٹی کی نظر بھی اتاری جس میں چند سفید دھجیوں کو پیلا رنگ لگا کر سر سے پاؤں تک سات مرتبہ اتار کر جلا دیا جاتا کبھی کیلے، انڈے، دیسی واہیات چیزیں بھی رات کو سرہانے رکھ کر صبح صدقے میں دے دیا کرتے۔“ (دلاسا، بکرا اتر گیا“ فاطمہ تاج، ص 26)

ایک عورت ہونے کے ناطے فاطمہ تاج نے عورتوں کے لطیف جذبات کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ان کی تحریروں میں نسائی فکر جھلکتی ہے۔ایک عورت کو انھوں نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے خاص کر طنز و مزاح کے پیرائے میں ان کا ایک مضمون ”ہم اور ہمارے وہ“ اس کی بہترین مثال ہے۔اس مضمون میں انھوں نے ان خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے جو ایک بیوی اپنے شوہر سے چاہتی ہے کہ شوہر اس کی تعریف کرے:

> ”دیکھیے تو ذرا ان کی عادتیں جو ہمارے لیے سوہان روح بن جاتی ہے اور کبھی دودھ اور شہد کی نہروں والی جنت میں سکون کا گمان ہونے لگتا ہے یہ عام آدمیوں کی طرح ہماری تعریف نہیں کرتے یہ ہمیں دنیا سے ہی نہیں خود اپنی ہی نظر سے چھپا رکھنا چاہتے ہیں۔ہمارا کوئی پکوان ان کی پسند کے قابل نہیں ہوتا جب کبھی ایسا اتفاق ہو تو ہم ان کی طرف بڑی امید سے دیکھتے ہے پہلے ”لقمہ لذیذ“ پر آج تو داد مل جائے مگر وائے ناکامی! یہ چپ چاپ پیٹ بھرنے کے بعد دستر خوان سے اٹھ جاتے ہیں اگر کبھی کسی ”ڈش“ میں مرچ زیادہ یا میٹھے میں شکر زیادہ ہو تو پہلے ان کی بھنویاں چڑھ جاتی ہے بعد میں یوں اظہار ہوتا ہے۔۔۔ہمیشہ ایسا پکوان تو نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔ مطلب یہی ہوا کہ ہم اچھا پکوان کرتے ہیں۔“

(ہم اور ہمارے وہ“ دلاسا“ فاطمہ تاج، ص، 40،41)

فاطمہ تاج کے مضامین میں ظرافت کی ہلکی گہری چبھن نظر آتی ہے۔ان کا طنز با اثر، موثر، اور بامعنی ہوتا ہے۔اس دور میں لکھی جانے والی طنزیہ تحریرات میں تہذیب و ثقافت کی رنگ آمیزی بھی خوب صورت انداز میں رچ بس گئی ہے۔

تانیثی اور نسائی فکر کو مزاح میں پیش کرنے کے لیے ان خواتین نے لاجواب اسلوب اختیار کیا ہے۔ان کے طرز بیان میں ایک عالمانہ نشانِ بے نیازی کے ساتھ ساتھ ادبیت، شعریت، ذہانت، اور شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔انھوں نے فکر کے زاویوں کو پیش کرنے کے لیے نئے الفاظ کی اختراع کرنے کے ساتھ ساتھ بعض متروک الفاظ کو دوبارہ قابل استعمال بنا دیا ہے۔

□□□

Dr. Shahzea Ashraf
Room No F-26
Girls Hostel (HK)
University of Kashmir
Hazratbal-190006 (Jammu & Kashmir)
shaziaashrafhcu92@gmail.com

ڈاکٹر عرشی سلطان

محسن بھوپالی

''حیرتوں کی سرزمین''

محسن بھوپالی نے ملک اور بیرون ملک کے کئی سفر کیے لیکن ان کا باقاعدہ سفرنامہ ایک ہی ہے، باقی اسفار کا کہیں کہیں ضمنی طور پر ذکر آ گیا ہے جیسے کسی انٹرویو یا مضمون میں لیکن انھیں سفرنامہ نہیں کہہ سکتے۔ یہ واحد سفرنامہ 1992 میں ''حیرتوں کی سرزمین'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ سفرنامہ ان کے امریکہ اور کینیڈا کے اسفار پر مبنی ہے۔ یہ سفر انھوں نے 1990 میں کیا تھا اور بنیادی طور پر مشاعروں اور کچھ سیمیناروں و مذاکروں کے لیے کیا تھا۔ ان کے اس پورے سفر میں مشہور شاعر حمایت علی شاعر اور جون ایلیا بھی ان کے ہم راہ تھے۔ ''حیرتوں کی سرزمین'' کے حرف آغاز میں محسن بھوپالی لکھتے ہیں۔

> '' 'حیرتوں کی سرزمین' کتابی شکل میں آنے سے پہلے برادرم علی سفیان آفاقی کی خصوصی توجہ کے ساتھ ''یہ ہے امریکہ'' کے عنوان سے ہفتہ روزہ فیملی میگزین لاہور میں قسط وار طبع ہو چکا ہے۔
>
> یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ 24 اکتوبر 1990 سے 25 دسمبر 1990 کے دوران کیے جانے والے اس سفر کا سفرنامہ بھی مذکورہ جریدے میں اکتوبر 1991 سے دسمبر 1991 کے دوران ۱۴ قسطوں میں شائع ہوا۔''

(محسن بھوپالی، حرف آغاز، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، 1992، ص:8)

یہ سفرنامہ محسن بھوپالی کی نثری تحریروں میں واحد صنف سخن ہے جسے تخلیقی اظہار کے ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سفرنامہ تخلیقی نثر ہے یا علمی؟ یہ بات موضوع بحث ہو سکتی ہے اور کئی بار اس کے مطالعہ کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ کئی بار مطالعہ کے بعد بھی فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اسے تخلیقی نثر مانا جائے یا علمی یا صحافتی؟ کچھ سفرنامہ نگار اپنے تخلیقی انداز بیان سے اسے تخلیقی بنا دیتے ہیں جب کہ کچھ لوگ اس میں علمی اور صحافتی خوبیاں کامیابی کے ساتھ لے آتے ہیں۔

محسن بھوپالی نے امریکہ اور کینیڈا کا سفر مشاعروں اور علمی مذاکروں میں شرکت کرنے کے لیے کیا تھا اور تقریباً دو ماہ تک ان دونوں ملکوں میں رہے اور کئی مشاعروں و سیمیناروں میں شرکت کی۔ اس سلسلے میں اس کتاب کا انتساب بہت دلچسپ ہے جو اس طرح سے ہے۔

> ''اردو شاعری کے نام، جس کی بدولت پورے دو ماہ تک بر اعظم امریکہ اور کینیڈا کے ایک درجن اہم شہروں کو دیکھنے اور سیر و سیاحت کرنے کا موقع ملا۔''

(محسن بھوپالی، انتساب، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، 1992)

یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ کوئی شاعر تقریباً دو ماہ تک امریکہ اور کینیڈا میں مختلف مشاعروں میں شرکت کرتا اور سیر و سیاحت کرتا رہے ایسا اعزاز بہت کم زبانوں کے اس سے بھی کم شاعروں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اردو شاعری کی مقبولیت اور شاعری کے زبانی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس شاعری کو لوگ پڑھنے سے زیادہ سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ بھی بہ زبان شاعر۔

اس سفرنامے کی نوعیت کے سلسلے میں محسن بھوپالی نے اس کتاب کے شروع میں 'اپنی بات' میں لکھا ہے۔

> '' 'حیرتوں کی سرزمین' کو آپ سفرناموں سے ہٹ کر پائیں گے۔ اس میں آپ کو نہ تاریخی اور جغرافیائی معلومات ملے گی۔ نہ تجارت و معاشیات کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندا اور نہ ہی دورانِ سفر کسی نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے مکالمے

اور بعد میں معاشقے کی داستان نظر آئے گی۔

یہ تو کینیڈا اور امریکہ میں شہروں شہروں منعقد ہونے والے سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کی روداد وطن سے دور اجنبی دیار میں اردو زبان کی ترویج واشاعت کرنے والوں کے ذکر اور سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔"

(محسن بھوپالی، اپنی بات، حیرتوں کی سرزمین، ایوان ادب، ناظم آباد، کراچی، 1992، ص:9)

اس سفرنامے کے مطالعے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محسن بھوپالی نے جو بات "اپنی بات" میں کہی ہے، بہت حد تک وہی حقیقت ہے۔ لیکن بات محض اتنی بھی نہیں ہے اس سفرنامے میں کئی اور چیزیں بھی ہیں۔ محسن بھوپالی خود پیشہ سے ایک انجینئر تھے، وہ اس سفرنامے میں امریکہ کی سائنس اور تکنیک میں غیر معمولی ترقی سے بہت متاثر ہیں، انھوں نے اس مجموعے کا نام بھی اسی نسبت سے رکھا ہے۔ ظاہر ہے امریکہ میں تاریخی اعتبار سے تو عجائبات ہیں نہیں جس کا محسن بھوپالی اس سفرنامے میں ذکر کرتے۔ امریکہ اور کینیڈا کی تقریباً تمام تر کامیابیاں اور کامرانیاں اس کی سائنسی اور معاشی ترقی سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھوں نے اس سفرنامے میں جگہ جگہ امریکہ کی حیرت کن سائنسی ترقی کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر "ایل۔اے۔ کے روز و شب" باب میں وہ لکھتے ہیں:

> "میں نے ریکارڈ کمپیوٹر میں اپنے تمام نغمے ریکارڈ کر دیے ہیں۔ کمپیوٹر کے ذریعے جتنی بھی دھنیں تیار کرتا ہوں وہ بھی ریکارڈ کمپیوٹر میں محفوظ کرتا جا رہا ہوں۔ نغموں کے ریکارڈ کے سلسلے میں ہم نے سوال کیا اگر اس وقت کسی نغمے کی فرمائش کی جائے تو۔ عالم گیر نے کہا پندرہ بیس سکنڈ میں نغمہ ریکارڈ کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے کے بعد آپ کو سنوا سکتا ہوں۔ ہم نے کہا مثلاً "خوشبو کا جھونکا ترے سنگ کر دیا ہے" والا نغمہ سنوا سکتے ہو؟ سوال سنتے ہی عالم گیر نے کہا لیجیے اور دو تین بٹن دبانے اور ناب کو اوپر نیچے کرنے کے بعد اسپیکر کے ذریعے وہ نغمہ کمرے میں گونجنے لگا۔ ایک صاحب نے کسی اور نغمے کی فرمائش کی اسے بجانے میں بھی دس پندرہ سکنڈ ہی لگے۔"

اس زمانے یعنی 1990 میں کمپیوٹر کی یہ تکنیکی کامیابی کسی حیرت سے کم نہ تھی لیکن آج کمپیوٹر کی یہ تکنیک بلکہ اس سے بھی ترقی یافتہ شکل ہندو پاک میں بھی عام باتیں ہو چکی ہیں۔ نئی نئی تکنیکوں کو سمجھنا، اس کا داد دینا اور اس کو استعمال سیکھنا انسان کا ایک فطری عمل ہے۔ محسن بھوپالی نے اس سفرنامے میں ایسی باتوں کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ صحیح ہے کہ یہ سفرنامہ بنیادی طور پر ادبی و تہذیبی سرگرمیوں پر ہی مبنی ہے۔

اس سفرنامے کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ حقیقی معنی میں ایک سفرنامہ ہے اس سفرنامے میں سفر کا ذکر بہت زیادہ ہے ورگرنہ اکثر سفرناموں میں دیکھا گیا ہے کہ شروع میں کسی سفر کا ذکر کیا اس کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گئے اور پھر وہاں کے روز و شب، وہاں کی تہذیب، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے یا رپورٹ تیار ہو جاتی ہے لیکن اس سفرنامے میں مختلف قسم کے اسفار کا تفصیلی ذکر ہے۔ چاہے وہ سفر ہوائی جہاز سے کیا گیا ہو، چاہے کار سے، یا پیدل ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ سفر پر بہت توجہ دی گئی ہے۔

اردو میں عام طور پر کامیاب سفرنامے طنز و مزاح نگاروں نے لکھے ہیں۔ ابن انشا، مجتبیٰ حسین وغیرہ کے نام سفرناموں میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ محسن بھوپالی کی شاعری میں طنز ان کی ایک نمایاں صفت ہے۔ یہ طنز عام طور پر سیاسی یا کبھی کبھی سماجی صورت حال سے پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں ایک قسم کی سنجیدگی طنز میں بھی موجود رہتی ہے۔ شروع کی شاعری میں مزاح تھا لیکن بعد میں بہت خال خال ہی کہیں طنز نظر آتا ہے۔ محسن بھوپالی کے سفرناموں کی زبان عام طور پر سنجیدہ، علمی یا صحافتی نوعیت کی ہے لیکن جہاں کہیں بھی موقع ملتا ہے وہ چٹکی لینے سے نہیں چوکتے، خاص طور سے تین شاعروں حمایت علی شاعر، جون ایلیا اور محسن بھوپالی کی آپسی نوک جھونک بڑی دلچسپ ہے، جگہ جگہ پر مزاحیہ مصرعے یا شعر بھی کہے گئے ہیں۔ کامیاب سفرناموں کے لیے زبان میں یا تو معقول مزاح ہونا چاہیے یا ایک قسم کی تخلیقیت ہونی چاہیے۔ محسن بھوپالی کے سفرنامے میں یہ صفات بھی موجود ہیں۔ مزاحیہ صورت حال کی خوبصورت مثال اس اقتباس میں بیان کی گئی ہے۔

> "گاڑی اب Pacific Coast ہائی وے پر فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی اور ہر موڑ پر اور ہر آنے والی گاڑی کے قریب تر آنے پر ہمارا پیر خیالی بریک پر جا پڑتا کا کو نے اس لاشعوری حرکت کو بھانپتے ہوئے کہا محسن صاحب بے فکر رہیں ان علاقوں میں دس سال سے ڈرائونگ کر رہا ہوں......
> مگر بھائی ہم تو پہلی دفعہ آئے ہیں اس پر سبھی ہنس پڑے۔"

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے مشہور اور معتبر شاعر جون ایلیا اس پورے سفر میں محسن بھوپالی کے ہم راہ تھے ان کی لمبی زلفیں اور دیگر رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اکثر لوگوں کو شبہ ہو جاتا تھا کہ وہ خاتون ہیں۔ ہوائی جہاز سے لاس اینجلس جاتے وقت کچھ ایسا ہی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر محسن بھوپالی نے "حیرتوں کی سرزمین" میں اس طرح کیا ہے۔

"اسٹیورڈ نے متوجہ کرتے ہوئے کھانے کے بارے میں

دریافت کیا۔ہم نے صرف دو لفظ ادا کیے فـــش پلیـز۔او کھے! کہہ کر اس نے بھائی جون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہاmadam of same (یہی خاتون کے لیے ہے) ہم نے ہنسی روکتے ہوئے یس پلیز کہا۔ بھائی جون نے ایک مرتبہ پھر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا گویا یہاں بھی! ہاں! یہاں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ ہم نے جملہ پورا کر دیا۔حمایت ذرا فاصلے پر تھے۔ وہیں سے بلند آواز میں بولے! کہ کیا ماجرا ہے؟ ہم نے کہا وہی غلط فہمی اسٹیورڈ انہیں میڈم سمجھ رہا تھا۔ ٹرالی آ چکی تھی۔ اسٹیورڈ نے ٹرے نکال کر سیٹ کاؤنٹر پر بڑے احتیاط سے ہی تھی کہ ہم نے اس کے کان کے قریب ہو کر کہاHe is man اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔آئی ایم سوری لیکن دو قدم آگے جا کر اس نے پھر مڑ کر دیکھا جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہو۔"

اس سفرنامے میں اس کتاب میں شائع ہونے والی تصویریں بھی ہیں جو مختلف مقامات کی ہیں اور سرِ ورق سے لے کر کئی اندرونی صفحوں میں شائع ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں آزادی کا بت، اونچی اونچی عمارتوں، باغات، بحرالکاہل اور قدرتی مناظر و چند دیگر مقامات کی ہیں۔ کچھ میں محسن بھوپالی بھی نظر آتے ہیں اور کچھ میں صرف عمارتیں یا دیگر ترقیاتی مناظر نظر آتے ہیں۔ چونکہ یہ کتاب ایک سفرنامے پر مبنی ہے اس لیے ان تصویروں سے سفرنامہ اور بھی مستند جاتا ہے۔

□□□

Dr. Arshi Sultan
H.No. 23, Gali No. 2
Near Masjid-e-Bajodiyan
Mangalwara Road,
Chhwani, Bhopal-462001 (M.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

شبیر احمد ڈار

ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کا تنقیدی جائزہ

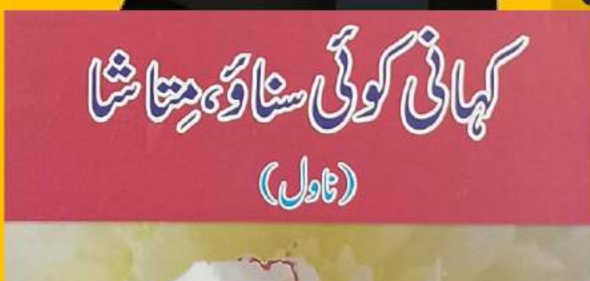

ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' صادقہ نواب سحر کا پہلا ناول ہے جو 2008 میں شائع ہوا۔ ناول کا مرکزی کردار متاشا ہے جس کے گرد پوری کہانی گردش کرتی ہے۔ اس ناول کے اور بھی کئی جاندار کردار ہیں جن کی کہانیاں بھی متاشا کی کہانی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر یہ کہانیاں بھی متاشا ہی کی معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ان کا تعلق بالواسطہ متاشا کی زندگی کے ساتھ ہے جن کے بغیر اس کی کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے جس میں متاشا کی زندگی کے تمام واقعات اور ہر ایک پہلو کو چھونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کو مصنفہ نے مختلف ذیلی ابواب میں تقسیم کر کے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ اس ناول میں کئی جگہوں پر نہ صرف عورت کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے بلکہ ان نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے جس کے لیے خود کلامی کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔ ناول متاشا کی مظلوم داستان پر مبنی ہے۔ ہندستانی سماج میں عورتوں کے خلاف ہو رہے ظلم و جبر، تشدد اور جنسی استحصال اور ان مظالم کے خلاف عورت کی محاذ آرائی اور جدوجہد کو متاشا کے ذریعے بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی کہانی متاشا کے خاندانی پس منظر سے شروع ہوتی ہے اور ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے نسل در نسل تک سفر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے آباؤ اجداد صاحب ثروت ہوتے ہیں اور جگن ناتھ پوری مندر کے شاستری ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ جس کو متاشا کے والد اپنی بُری عادتوں کی وجہ سے برقرار نہیں رکھ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن اس کو اینٹ کی فیکٹری میں فورمین کی نوکری کرنی پڑتی ہے۔ عیسائی

مذہب قبول کرنے کے بعد بھی اس خاندان میں نسلی اور ذات پات کا تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا رہتا ہے۔

مِتا شا والدین کی پہلی اولاد ہے جس کی پیدائش پر تمام اہل خانہ خوشی کے بجائے ماتم مناتے ہیں۔اس کے والد اس صدمے کی وجہ سے تین مہینے تک اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھنے نہیں جاتے کیوں کہ وہ شروع ہی سے لڑکیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔اپنی بیوی کو بار بار مارنا پیٹنا ان کے معمول میں شامل ہوتا ہے لیکن مِتا شا کی اتنی ہمت کبھی نہیں ہو پائی کہ درمیان میں کوئی بات کہہ پائے۔ابتدائی تعلیم کے بعد اسے ہاسٹل میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں وہ راحت کی سانس لیتی ہے۔وہ چھٹیوں کے دنوں میں بھی گھر نہیں جانا چاہتی اور اپنے گھر کو ''پھٹکار گھر'' کہتی ہے۔نویں جماعت میں اسے ایک اجنبی لڑکے کا پیار بھرا خط ملتا ہے جو اس کی بنجر زمین پر بارش کا کام کرتا ہے۔جب وارڈن کے ہاتھ خط لگ جاتا ہے تو وہ والد کے ڈر سے بائبل پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھاتی ہے جس کا احساس اسے زندگی بھر رہتا ہے اور زندگی کے اخیر پڑھاو تک ہر مصیبت کی وجہ اسی کو قرار دیتی ہے۔

اسکول کا مرحلہ طے پانے کے بعد مِتا شا کالج میں داخلے کے لیے روانہ ہوتی ہے جہاں وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے۔ایک روز اس کے والد سیر و تفریح کی غرض سے کلکتہ چلے آتے ہیں اور اپنی بیٹی کے ہمراہ اپنے ہم عمر دوست سے ملنے جاتی ہیں۔ایک دن باپ کا دوست موریشور کاکا مِتا شا کو اپنے فارم ہاؤس پر لے جاتا ہے جہاں وہ بچپن سے جایا کرتی تھی اور اس کی عزت کو تار تار کرتا ہے۔یہ حادثہ مِتا شا کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔اسے اس بات کا بھرپور یقین تھا کہ اگر اس بات کا ذکر وہ والدین سے کرتی ہے تو اسے ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آ رہا تھا کہ بھائیوں کی غلطیوں پر بھی مِتا شا ہی کو مار پڑتی تھی۔مِتا شا اس المناک حادثے کے بعد موریشور کاکا کے علاوہ دیگر مردوں سے بھی سخت نفرت کرنے لگتی ہے جس میں اس کا باپ بھی شامل ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی ہمیشہ اپنے بیوی بچوں کو پیٹتا اور گالیاں دیتا رہتا ہے۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ خود ہی کہتی ہے:

''ان دنوں مردوں سے نفرت کا احساس مجھ میں اتنا بڑھ گیا کہ گھر آ کر کوئی صوفے یا کرسی پر بیٹھتا تو میں وہ حصہ جھٹک کر صاف کر دیتی، پونچھ لیتی ۔ دادی مجھے ایسا کرنے سے منع کرتیں۔۔۔''

(کہانی کوئی سناؤ مِتا شا، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 2008،ص27)

منجو نام کی ایک لڑکی کلکتے میں مِتا شا کی ساتھی بن جاتی ہے۔کچھ عرصے بعد مِتا شا کی دوستی منجو کے اپاہج بھائی پربھاکر سے ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ محبت میں تبدیل ہوتی ہے۔دونوں آپس میں شادی کرنا چاہتے ہیں مِتا شا کا باپ بھرت نام کے لڑکے کا رشتہ لے کر آتا ہے۔انکار کرنے اور پربھاکر سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے پر اس کا باپ مِتا شا پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگاتا ہے جو بالآخر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ مِتا شا کی ماں اور اس کا بھائی گوپی اس شادی کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ مِتا شا کی ماں پہلی بار اپنے شوہر کے خلاف اپنی بیٹی کے لیے لڑتے ہوئے شوہر سے کہتی ہے:

''ایک قدم بھی آگے آئے تو لکڑی جلا کر بھون دوں گی۔۔۔ میں نے آپ کی ہر بات سہن کی بھرت سے شادی کر کے بیٹی کی زندگی اجاڑنے نہیں دوں گی۔'' (ایضاً،ص53)

بالآخر ان سب کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔مِتا شا کی دادی بھی اپنی بہو کے ساتھ ہی گھر سے نکل جاتی ہے۔ان کی دادی بھی روایتی ساس سے الگ ہے جو اپنی بہو کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور اپنے بیٹے کے خلاف پولیس میں شکایت بھی درج کراتی ہے۔مِتا شا پہلے ماں اور تینوں بھائیوں کے ساتھ ماموں کے گھر رہنے آتی ہے لیکن اس کی معاشی حالت خراب ہونے کے سبب وہاں سے بھی نکلنا پڑتا ہے۔اس طرح علی گڑھ، ممبئی، الہ آباد جیسے شہروں میں بھٹکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔علی گڑھ میں پہلے اپنے چچا سوریہ کاکا کے گھر میں رہتے ہیں جو مِتا شا کو ایک نوکری بھی دلواتا ہے لیکن اس کے بدلے میں اس کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے کسی طرح اپنی عزت بچانے میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے اور چچا کا گھر چھوڑ کر کرائے کے مکان میں رہنے لگتی ہے۔مِتا شا کی سگی کاکی ایک جگہ کہتی ہے:

''مجھے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ مِتا شا کے لیے انھیں اٹریکشن (کشش) ہو گیا ہے، ان کی تو بہت سی گرل فرینڈ ہیں، لیکن یہ بھتیجی!!۔'' (ایضاً،ص59)

استحصال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی سگی چاچی بھی اس بے ہودگی پر اپنے شوہر سے کچھ نہیں کہتی بلکہ اس کے دیگر لڑکیوں سے تعلقات کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔حالاں کہ وہ خود ایک عورت ہے۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران سمیر نامی ایک نوجوان عیسائی لڑکا مِتا شا سے محبت کرنے لگتا ہے لیکن منگنی کے باوجود سمیر کا باپ رشتہ توڑ دیتا ہے کیوں کہ مِتا شا اور اس کی ماں کے کردار اسے مشکوک لگنے لگتے ہیں۔ اس میں بھی مِتا شا کے چچا کا ہی ہاتھ ہوتا ہے جو ہر طرح انھیں اپنا محتاج

بنائے رکھنا چاہتا ہے تاکہ اسے مِتاشا کے جسم کالمس حاصل ہوسکے۔دادی اس کے چچا کی سگی ماں تھی لیکن اس بات کواس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔اس کے باوجود لوگوں کو مِتاشا کے چچا کی اصلیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ دادی کے انتقال پر آخر کارایک عورت متاشا کی ماں کے بارے میں کہنے پر مجبور ہوگئی۔

”۔۔۔۔ہسبنڈ کے ساتھ نہ رہتے ہوئے بھی ساس کو اپنے ساتھ رکھا۔اس کی سیوا کی اور یہ ہمارے صاحب، (متاشا کے چچا) اتنا شاندار مکان ہوتے ہوئے بھی اپنی بوڑھی ماں کو اپنے ساتھ نہ رکھ سکے۔“(ایضاً،ص76-77)

مِتاشا نوکری کی تلاش میں ممبی، پونا، کھنڈالہ اور دیگر شہروں کا سفر کرتی ہے اور بالآخر اپنے بھائی پرساد کے ذریعے اس کی ملاقات پونا میں ایک گجراتی تاجر ساہوکار گوتم شاہ سے ہوتی ہے جو عمر میں اس سے بائیس سال بڑا اور پانچ بچوں کا باپ ہوتا ہے۔گوتم شادی کی پیشکش کرتا ہے تو گھر کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اسے قبول کرتی ہے۔پرساد اور اس کی ماں بھی اس رشتے کو خوشی خوشی قبول کرتے ہیں اس طرح وہ گوتم کے پانچ بچوں کی کفالت کے علاوہ اپنے بھائی کی بھی مدد کرتی ہے حالاں کہ اس کے بھائی پرشانت اور گوپی شروع شروع میں اس کے سخت مخالف ہوتے ہیں۔

شادی کے بعد متاشا کا باپ اپنے دوست موریشور کے ساتھ مِتاشا سے ملنے آتا ہے۔گوتم سے متاشا کے بطن سے ایک لڑکا دیپیش پیدا ہوتا ہے۔گوتم کی پہلی بیوی سے جو پانچ بچے تھے ان میں انکت سب سے بڑا ہوتا ہے۔شراب نوشی، سگریٹ پینا، مار پیٹ کرنا، دیر رات باہر رہنا اس کا معمول تھا۔ایک دن پتہ چلتا ہے کہ گوتم کے دونوں گردے خراب ہیں ٹھیک ہونے پر وہ اپنا کاروبار پھر سے سنبھال لیتا ہے۔اس کا بیٹا دسویں جماعت میں ہی تھا کہ شوہر گوتم کی بھی موت ہوجاتی ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد انکت اپنی سوتیلی ماں مِتاشا پر بُری نظر ڈالتا ہے بلکہ اپنی سگی بہن کومل کو بھی غلط طریقے سے ہاتھ لگاتا ہے جس کی شکایت وہ مِتاشا سے کرتی ہے۔دن بہ دن اس کی دست درازیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں اور وہ کئی بار مِتاشا کا گلا دبانے کی بھی کوشش کرتا ہے۔بالآخر مِتاشا اور اس کے بیٹے کو گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔متاشا جو ساری عمر دوسروں کی مدد کرتی آئی ہے اس مصیبت کی گھڑی میں اس کے بھائی بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔دونوں بھائیوں کے کردار بھی ان مردوں سے مختلف نہیں ہیں جو عورت کو کمتر، مجبور سمجھتے ہیں۔شوہر کے مرنے کے بعد پرساد اور گوپی دونوں نے اپنی بیویوں سے مل کر مِتاشا کی بے عزتی کی اور اس کو سہارا دینے کے بجائے باہر کا راستہ دکھایا یہاں تک کہ پرشاد کی بیوی نے اروی کی شادی پر مِتاشا کو بلانا بھی گوارا نہیں کیا۔پرشانت اپنی بیوی چھایا کے ساتھ دبئی میں جاکر نوکری کرتا ہے۔ اور متاشا کبھی مذہب میں سکون تلاش کرتی ہے، کبھی چھوڑتی ہے۔کبھی مندر، کبھی چرچ (کلیسا) تو کبھی درگاہ کی سیڑھیوں پر اپنا ماتھا ٹیکتی ہے۔

ایک وکیل کی مدد سے گوتم کے جائیداد میں سے مکان اس کو مل جاتا ہے جہاں وہ اپنی بقیہ زندگی اپنے بیٹے کے ساتھ گزارتی ہے۔ان کی پریشانیوں میں اس وقت مزید اضافہ ہوجاتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بیٹا اپنے سے زیادہ عمر کی لڑکی نوتیتا کے عشق میں گرفتار ہے اور بچے کا باپ بھی بننے والا ہوتا ہے۔دیپیش نے ماں کو اس بات سے بے خبر رکھا تھا لیکن نونیتا مِتاشا کو سارا ماجرا سناتی ہے

”ممی آپ نے مجھے بُلایا۔“ ڈری ڈری نونیتا چوکھٹ کے اندر آئی۔میں نے اشارے پاس بلاکر گلے لگالیا۔میں آپ کو بتانے آئی تھی کہ میں۔۔۔۔ماں۔۔۔“اس نے سر جھکالیا۔ اس کا سرخ ہوتا چہرہ مجھے بہت کھ بتا گیا میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”دیپو جانتا ہے؟“ ”ہاں، گرادینے کو کہتا ہے“ ۔۔۔۔ پھر؟۔۔۔۔۔”زیادہ دن ہوگئے ہیں جان کا خطرہ ہے۔“ میری نظریں چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ میں کرسی پر گرگئی۔۔۔۔پھر میں نے آنکھیں کھولیں اور کہا۔”اس سے کہنا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔پھر بھی نہیں مانتا تو بچہ مجھے دے کر کہیں اور اپنی زندگی بسالینا۔میں تمہیں اپنے بیٹے کی ذمہ داریوں سے آزاد کرتی ہوں۔!!“(6)(ایضاً،ص230)

یہ ناول اڑیسہ کے ایک چھوٹے سے دیہات سے شروع ہوکر ہندستان کے مختلف شہروں کا احاطہ کر کے مہانگری ممبئ میں ختم ہوتا ہے اور متاشا کی دادی پر ہو رہے ظلم سے شروع ہوکر متاشا کی ہمدردی اور محبت پر ختم ہوتا ہے۔گھر والوں میں متاشا کو سب سے پہلے دادی ہی پیار کرتی ہے اور متاشا بھی اپنے بیٹے کی اولاد کو دادی کے روپ میں سب سے پہلے نہ صرف قبول کرتی ہے بلکہ اس کی پرورش کا ذمہ بھی خود لیتی ہے۔اس بچے میں مِتاشا کو زندگی کی رمق دکھائی دیتی ہے۔یہاں ناول نگار نے بڑی فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مِتاشا جیسی لڑکیوں کے مسائل کا سلسلہ آسانی سے ختم ہونے والا بھی نہیں ہے۔

مِتاشا کا کردا ہندوستانی عورت کے کردار کو پیش کرتا ہے جو سماج کے بے جا رسوم و رواج کے خلاف پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ بچپن میں اپنے باپ کے سامنے نہیں بول پائی لیکن اپنی حرکات و

سکنات سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق ہی کرتی ہے۔ رشتوں کے آگے اگرچہ وہ مجبور ہو کر اپنی زبان نہیں کھول پائی لیکن اپنی انا، خودداری اور حقوق سے سمجھوتہ نہیں کرتی جس کی بہترین مثال اس وقت ملتی ہے جب موریشور کا کا اس کی عزت پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور وہ ساری عمر اس سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ ایک اور مثال علی گڑھ میں اس وقت دیکھنے کو ملتی ہے جب اس کا سگا چچا سوریہ کا کا فیکٹری میں لے جا کر مِتا شا کے ہونٹ زور سے چوم لیتا ہے۔ خستہ مالی حالت کے باوجود وہ سمجھوتہ نہیں کرتی یہاں وہ خاموش نہیں رہتی بلکہ ماں کو بتاتی ہے جو اس کی ایک اچھی دوست بن چکی ہوتی ہے اسی لیے چچا کا گھر بھی چھوڑتے ہیں جو اپنے آپ میں ایک احتجاج ہی ہے۔ رونق مِتا شا کے چھوٹے دیور کا لڑکا ہے لیکن باوجود اس کے رونق اپنی تائی (متاشا) کے قریب جانا چاہتا ہے۔ چوں کہ وہ عمر میں اس سے چھوٹا ہوتا ہے تو متاشا یہاں بغیر کسی غصے کے اسے آرام سے سمجھاتی ہے۔ اس کے علاوہ مِتا شا کو ڈاکٹر پر بھا کر، موریشور کا کا بھائی جھنّو، یووراج، منجیت (سردار)، سمیر جیسے لوگ بھی ملتے ہیں جو کسی قسم کی زبردستی تو نہیں کرتے لیکن وہ اس کا سہارا بھی نہیں بن سکے۔ اس سے ہمیں زوال آمادہ معاشرے اور رشتوں کے تقدس کی پامالی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ متاشا اگرچہ موجودہ دور اور نئے زمانے کی عورت ہے لیکن اس کے باوجود ایک مشرقی عورت کا عکس بھی اس میں دکھائی دیتا ہے۔ ماں باپ سے مار کھا کر آنسو بہانا، باپ کے پُر اسرار رویے کو معاف کرنا، والد کی عمر کے مرد سے عصمت لُٹ جانے کا صدمہ دل میں دبائے رکھنا یہاں تک کہ اپنی والدہ سے بھی اس کا ذکر نہ کرنا، گھر والوں کی خوشی کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا، اپنی زندگی داؤ پر لگانا مشرقی عورت ہی کی روشِ عام ہے۔

ایک انوکھی بات جو اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شوہر کے انتقال پر ہندوستانی عورتیں بیوہ کا روپ دھارن کرلیتی ہیں۔ کنگن توڑنے پڑتے ہیں۔ رنگین کپڑوں کے بجائے سفید لباس پہن کر سار زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ کئی جگہوں پر عورت کو اپنے بال تیاگ کر کے منڈن کروانا پڑتا ہے۔ لیکن گوتم کے انتقال پر ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا نہ ہی دوسری شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔

> ”ہمارے لوہانہ دیشوی سماج میں تو ایسا نہیں ہوتا، جب باہر جاؤ گی تو گلے میں منگل سوتر ڈال کر جانا، کسی کو بھی سمجھ میں نہ آئے کہ آدمی نہیں ہے، زمانہ اچھا نہیں ہے، پہلے کی طرح رہنا۔ ۔۔۔ میں اپنی چھوٹی نند کی شاندار شادی میں بھی شریک ہوئی تھی۔ لڑکا کنوارا تھا، لڑکی کے ڈیڑھ سال کے دو جڑواں بچے تھے اور یہ کوئی محبت کی شادی نہیں تھی۔“

(ایضاً، ص 175-176)

اس اقتباس میں ایک جملہ قاری کو چونکا دیتا ہے جب اسے کہا جاتا ہے کہ ”جب باہر جاؤ گی تو گلے میں منگل سوتر ڈال کر جانا، کسی کو بھی سمجھ میں نہ آئے کہ آدمی نہیں ہے، زمانہ اچھا نہیں ہے“۔ یہاں پر اس سماج کی پول کھل جاتی ہے جو اپنے آپ کو مہذب کہہ کر بیوہ عورت کو رنگین کپڑا پہننے کی اجازت تو دیتا ہے، سجنے سنورنے کی بھی اجازت دیتا ہے لیکن ایک بیوہ کو باعزت اور باوقار زندگی گزارنے نہیں دیتا جس وجہ سے اس سماج کے مردوں میں اسے اپنی بیوگی رنگین ساڑھی اور منگل سوتر پہن کر چھپانی پڑتی ہے۔

ناول کا اسلوب بے حد سادہ ہے۔ صادقہ نواب سحر نے تمام ذیلی عنوانات کو ملا کر اور ان میں منطقی ربط و تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ناول تخلیق کیا۔ مقامات کا تعارف کرواتے وقت منظر نگاری پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ ناول میں حالات و واقعات اور موقع و محل کے مطابق زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور جس طبقے کا بھی ذکر کیا ہے اس کی معاشرت کو من و عن پیش کیا ہے۔ مصنفہ نے ان طبقات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اسی لیے ان میں حقیقت نظر آتی ہے۔ کلکتہ، علی گڑھ، ممبئی، کھنڈالہ، لوناولا، پونا، منالی اور کولم جیسے مقامات کی منظر کشی وہاں کا رہن سہن، کھان پان، بول چال غرض ہر ایک چیز کا مصنفہ نے کامیاب نقشہ کھینچا ہے۔ علی گڑھ کی تہذیب کے حوالے سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس میں حفظ مراتب کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

> ”آداب، آیئے، تشریف رکھئے، ٹھنڈا لیں گے یا گرم؟“ ان کی تین سال کی بچی بڑے ادب سے ہتھیلی پیشانی تک لے جاتی ہے۔ میں اس کو چاکلیٹ کا ڈبہ دینا چاہتی ہوں، پانچ چھے بار کہنے پر بھی نہیں لیتی۔ ہر بار شکریہ کہتی ہے۔ آخر اپنی مما کے سمجھانے پر لیتی ہے۔“ (ایضاً، ص 62)

□□□□

Shabbir Ahmad Dar

University of Hyderabad

India Post Lingampally CR Rao Road,

Hyderabad Central University Rd

Gachibowli

Hyderabad-500046 (T.S)

Mob: 7006921912

خواتین کے لیے اعلیٰ تعلیم کا نظم
ایک جائزہ

پروفیسر مشتاق احمد آئی پٹیل

دنیا کی آبادی پر ایک نظر ڈالی جائے تو خواتین کی آبادی کل آبادی کا نصف حصہ نظر آتی ہے۔ اب بحیثیت محقق و معلم یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہی تناسب ان کا تعلیم کی ہر سطح پر نظر آتا ہے؟ نسوانیت کے حامی اسکالرز یہ مانتے ہیں کہ لڑکیاں بڑی مشکل سے اسکولی تعلیم تک پہنچ پاتی ہیں سماج میں ایسے حالات ہیں کہ عورتوں کو پہلے درجے کا شہری یا یکساں شہری نہیں مانا جاتا، Sifuna(2006) لکھتے ہیں کہ سماج میں عورتوں کی تعلیم کو کنٹرول کیا اور خواتین کو ماتحت پوزیشن میں رکھا گیا ہے۔ باوجود اس کے بہت سے انفرادی حصولیابیاں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں، جو اعلیٰ تعلیم کا محاصل ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہندوستان میں خواتین کے لیے تعلیم کا نظام کیسا ہے؟ اعلیٰ تعلیم میں عورتوں کی شراکت داری کتنی ہے؟ ہمارے ملک کی ترقی کے لیے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ اپنے معاشرے کے تمام طبقوں کو تعلیم فراہم کی جارہی ہے، یا کوئی طبقہ اس عمل سے غیر حاضر رہ گیا ہے؟ زیرِ نظر مضمون خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے نظام، ان کی تعلیم کے لیے کام کر رہے اداروں، اداروں میں رہائش کی سہولیات اور طرزِ تعلیم پر توجہ دے رہا ہے۔

خواتین کی فہرست میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی، بیجاپور کی حکمران چاند بی بی، مملوک سلطنت کی رضیہ سلطان، آزاد ہندوستان کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی، ہمارے ملک کی موجودہ صدر دراپدی مرمو جی، اگنی IV میزائل کی پروجیکٹ ڈائرکٹر ٹیسی تھامس، چاند پر جانے والی سنیتا ولیمس، بوکسنگ جیتنے والی نکہت زرین، بیڈمنٹن جیتنے والی پی وی سندھو، رننگ ریس کی چیمپیئن پی ٹی اوشا جیسی بے شمار مثالیں زمانے دراز سے ہمارے ملک میں موجود ہیں، جنھوں نے حصولیابی کی بلندیوں کو چھوا ہے۔ اس کے علاوہ بھی سماج میں ہم کئی کامیاب ایڈمنسٹریٹو آفیسرز، ڈاکٹرز، درس و تدریس سے وابستہ خواتین کو آج بھی دیکھتے ہیں۔ لیکن پردہ دار خواتین اور روایتی خیالات والے لڑکیوں کے لیے خصوصی اداروں کی ضرورت آج بھی ہے۔ ساتھ ہی خواتین اساتذہ لڑکیوں کو اچھی طرح سمجھ کر انھیں خصوصی طور پر تعلیم دے سکتی ہیں۔

عملی تعریفیں:

ادارہ: اس مضمون میں ادارہ کا مطلب گورنمنٹ کی تسلیم شدہ کالجز اور یونیورسٹیوں ہیں، جن کا ڈیٹا AISHE میں موجود ہے۔

صنف: اس مضمون میں صنف سے مراد لڑکیاں، خواتین و عورتیں ہیں جو اعلیٰ تعلیم سے جڑی ہیں اور جن کا ذکر طالب علم یا استاد یا دیگر کسی صلاحیت سے AISHE کے ڈیٹا میں ملتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم: 10+2+3 نظام تعلیم میں 3+ یعنی ڈگری یا اس سے آگے کی تعلیم ہے، جو UGC سے تسلیم شدہ ادارہ فراہم کرتے ہیں۔

متعلقہ ادب کا جائزہ

Buckner(2013) کا یہ ماننا ہے کہ پبلک سیکٹر یعنی گورنمنٹ میں داخلہ کے لیے کچھ ایسی امتحانی شرائط رکھی جاتی ہیں جو خواتین کے اعلیٰ تعلیم میں داخلہ کے لیے سہولت نہیں فراہم کرتیں۔ Sifuna(2006) کہتے ہیں کہ لڑکیوں کے لیے ناقص معیار کی ثانوی تعلیم کا اثر سرکاری یونیورسٹیوں میں میڈیسن اور انجینیئرنگ جیسے زیادہ مسابقتی کورسز میں ان کی سنجیدہ کم نمائندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ "اس وقت سوال اٹھتا ہے کہ کون سے اقدامات اٹھائے جائیں کہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم بہتر ہو۔ کیا خواتین کے مسائل ان کے رہائشی علاقوں کی بنیاد پر بھی ہوتے ہیں؟ بروک و دیگر (Brock et. al. 1997) کے مطالعہ کے مطابق دیہی علاقے میں رہائش پذیر خواتین کو مردوں کے مقابلہ غربت اور غذائیت کی کمی جیسے صحت کے اثرات سمیت کئی عوامل تعلیم میں ان کی شرکت کو متاثر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مطالعہ میں خواتین کی تعلیم کے مسئلوں کے حل کے لیے چند اقدامات کا ذکر کیا لیکن اس طرف نشاندہی کی کہ ان اقدامات کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سیاسی عزم کی بڑی حد تک کمی تھی۔ معیاری اور اعلیٰ تعلیم صرف ایک گروہ تک محدود نہیں ہونی چاہیے، اگر ملک کی ترقی چاہیے تو اسے ہر گھر تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یہی بات El Baradei (2010) کچھ اس طرح کرتے ہیں، "مصری آبادی کا ایک نسبتاً چھوٹا حصہ معیاری اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے مستقبل میں ترقی اور خوشحالی کے امکانات خطرے میں پڑ جائیں گے۔" یعنی پورے ملک کی ترقی اگر چاہیں تو سبھی کے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ ساتھ میں ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اپنے معاشرے کے تمام طبقوں کو تعلیم فراہم کر رہے ہیں، کیا کوئی طبقہ اس عمل سے اچھوتا رہ گیا ہے؟ اور زیرِ غور مضمون میں انھیں کچھ سوالات اور دستیاب متعلقہ ادب یا مواد کے گیپ نے تفتیش کار کو ہندوستانی اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی حیثیت کا جائزہ لینے پر آمادہ کیا۔

مطالعہ کا طریقہ کار

مضمون نویس AISHE(2020-21) ویب سائٹ سے ڈیٹا جمع کر کے اس کا مطالعہ کیا، اور ڈیٹا سے ابتدائی تجزیات حاصل کیے۔ مختلف سوالات کے جوابات کی تلاش میں حاصل ڈیٹا کی کل کو گنا گیا اور حاصل کردہ کل جمع کو ہر سوال کے مطابق ایک جدول میں رکھا گیا۔ ضرورت کے مطابق اس کا فیصد یا مجموعی تعدد (cumulative frequency) معلوم کی گئی اس طرح سے ملنے والے معطیات کو گراف/ترسیل کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ ڈیٹا کے تجزیہ کی تصدیق کے لیے اس میدان کے ماہرین سے تعلق پیدا کر کے تجزیات کیے گئے، جیسے ڈاکٹر محسنہ انجم انصاری نے ڈیٹا کو گراف کی شکل میں دینے کے لیے فیصد کی شکل میں ظاہر کرنے کے لیے مشورہ دیا جہاں پر دو یا دو سے زائد نتائج کا موازنہ یکساں میدان پر آسان ہے، جیسے اگر کل یونیورسٹیوں کا کالجس کی نسبت میں یا ان میں تعلیم پا رہے طلباء و طالبات کے کل داخلہ کا موازنہ حاصل کردہ کل نمبرات سے کیا جائے تو موازنہ صحیح نمائندگی نہیں کرے گا۔ جبکہ اس طرح کے اداروں میں مختلف متغیرات کو لے کر یا دونوں اصناف کی شرکت کو لے کر فیصد موازنہ بہتر ہوگا۔

عورتوں کی شراکت داری کو جاننے کے لیے مضمون نویس نے چار اہم تحقیقی سوالات تعمیر کیے، اس مضمون کے صفحات میں جگہ کی کمی زیرِ غور رکھ کر ان سوالات کا یہاں ذکر یہاں الگ سے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مضمون میں آگے ان سوالات کے ساتھ تجزیہ اور مباحثہ لکھا گیا ہے۔

تجزیہ اور مباحثہ

Q1: آبادی اور خواندگی کی صنفی شراکت کیا ہے؟

جدول نمبر 1: آبادی میں خواتین کا حصہ اور خواندگی کی شرح

اشارے Indicators	مرد Males	خواتین Females
آبادی Population	623270258 (51.47%)	587584719 (48.53%)
خواندگی Literate	434763622 (56.93%)	328875190 (43.07%)

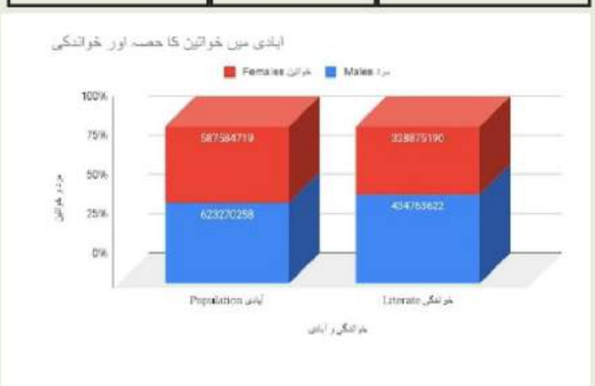

خاکہ نمبر 1: آبادی اور خواندگی کی صنفی شراکت

جب ہم ہمارے ملک میں خواتین کی آبادی کی شرح مردوں کے مقابلے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خواتین کی آبادی 48.53% اور اور مرد کی آبادی 51.47% ہے۔ اسی طرح سے شرح خواندگی میں بھی عورتیں مردوں سے پچھڑ رہی ہیں جہاں عورتوں کی خواندگی محض 43.07% اور مردوں کی خواندگی 56.93% ہے، جو تشویش کا باعث ہونا ضروری ہے۔

Q2: خواتین کے لیے مختص اداروں کا حصہ کتنا ہے؟

خاکہ نمبر 1: آبادی اور خواندگی کی صنفی شراکت

جدول نمبر 2: خواتین کے لیے مختص اداروں کا حصہ

ادارے	اداروں کا طرز	تعدد و فیصد	کل تعدد و فیصد
یونیورسٹیوں کا طرز	لڑکیوں کے لیے مختص یونیورسٹیاں	15 (1.49%)	1008 (100.00%)
	عام یونیورسٹیوں کی تعداد	993 (98.51%)	
کالجس کا طرز	لڑکیوں کے لیے مختص کالجس	4149 (9.57%)	43359 (100.00%)
	عام کالجس کی تعداد	39210 (90.43%)	

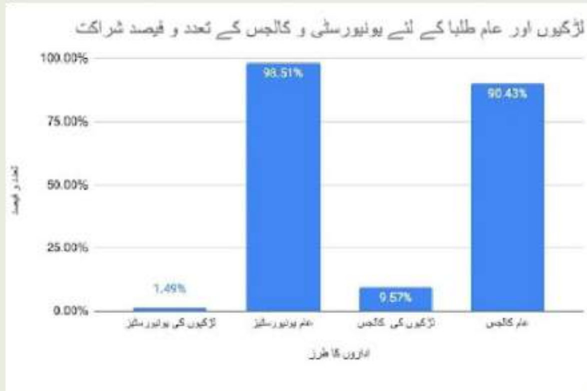

خاکہ نمبر 2: خواتین کے لیے مختص اداروں کا حصہ

ڈیٹا کے تجزیہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عام کالجز اور یونیورسٹیوں کے علاوہ لڑکیوں کے لیے خصوصی یونیورسٹیاں اور کالجز موجود ہیں۔ عام کالجز کا مطلب وہ کالجز جہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں پڑھتے ہیں۔ کل یونیورسٹیوں میں سے 1.49% لڑکیوں کی یونیورسٹیاں ہیں جبکہ 98.51% عام یونیورسٹیاں ہیں۔ وہیں 9.57% کالجز لڑکیوں کے لیے ہیں جبکہ 90.43% کالجز عام طلبہ کے لیے ہیں۔

Q3: مختلف اداروں میں خواتین اساتذہ کا حصہ کتنا ہے؟

جدول نمبر 3: مختلف اداروں میں خواتین اساتذہ کا حصہ

ادارہ	اساتذہ کی صنف	تعدد و فیصد	کل تعدد و فیصد
یونیورسٹی	کل مرد اساتذہ	213743 (63.94%)	334274 (100.00%)
	کل خواتین اساتذہ	120531 (36.06%)	
کالج	کل مرد اساتذہ	1181661 (56.47%)	2092656 (100.00%)
	کل خواتین اساتذہ	910995 (43.53%)	

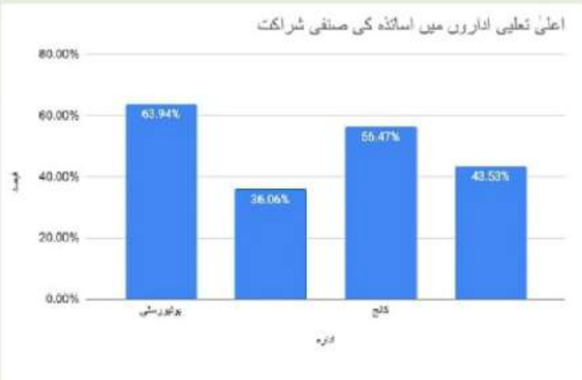

خاکہ نمبر 3: مختلف اداروں میں خواتین اساتذہ کا حصہ

یونیورسٹی میں اساتذہ کے موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ 36.06% خواتین اور 63.94% مرد اساتذہ ہیں، یعنی عورتوں کی شرکت مزید سدھارنے کی گنجائش ہے۔ کالجز میں 43.53% خواتین اور 56.47% مرد اساتذہ ہیں۔ حالانکہ جہاں شماریاتی طور پر کالجز کا یہ ڈیٹا یونیورسٹیوں سے بہتر ہے، لیکن پھر بھی ملک میں خواتین کی آبادی 48.53% (جدول 1) سے بہتر نہیں ہے۔

Q4: مختلف طرز کے کورسز (ریگیولر و فاصلاتی) میں صنفی شرکت کیا ہے؟

جدول نمبر 4: مختلف طرز کے کورسز (ریگیولر و فاصلاتی) میں صنفی شرکت

طلباء	طرز تعلیم	صنف	تعداد
کالجس	ریگیولر کورس	لڑکے	12937026 (48.45%)
		لڑکیاں	13766431 (51.55%%)
یونیورسٹی	ریگیولر کورس	لڑکے	1938592 (58.15%)
		لڑکیاں	1395236 (41.85%)

	فاصلاتی کورس	لڑکے	2367018 (55.61%)
		لڑکے	1889398 (44.39%)

خاکہ نمبر 4: مختلف طرز کے کورسز (ریگیولر و فاصلاتی) میں صنفی شرکت

یونیورسٹیوں میں ریگولر اور فاصلاتی طرز پر تعلیم دی جا رہی ہے۔

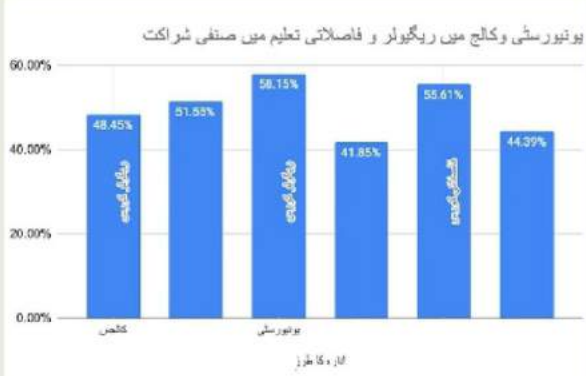

ریگولر کورسس میں لڑکیاں 41.85% ہیں , لڑکے 58.15% تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جبکہ 44.39% لڑکیاں اور 55.61% لڑکے فاصلاتی نظام سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح کالج کے ڈیٹا کے موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ کالجز میں صرف ریگولر تعلیم چل رہی ہے، 51.55% لڑکیاں اور 48.45% لڑکے اس میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں جو کہ ان کے ملک میں آبادی کے حصہ 48.53% (جدول 1) سے قدرے بہتر ہے۔

Q5: مختلف پالیسی ادوار کے دوران گرلز یونیورسٹیوں اور کالجس کے قیام اور مجموعی تعدد کتنا ہے؟

جدول 5: مختلف پالیسی ادوار کے دوران گرلز یونیورسٹیوں اور کالجس کی مجموعی تعدد و شراکت

	Colleges		Universities	Year of Establishment
Cumulative Progress	No.	Cumulative Progress	No.	
63 (1.54%)	63	4 (2.67%)	4	Before independence (<1947)
366 (8.95%)	303	5 (33.33%)	1	Before first NPE (1968-1947)
759 18.55%)	393	7 (46.67%)	2	First NPE to 2nd NPE (84-1968)

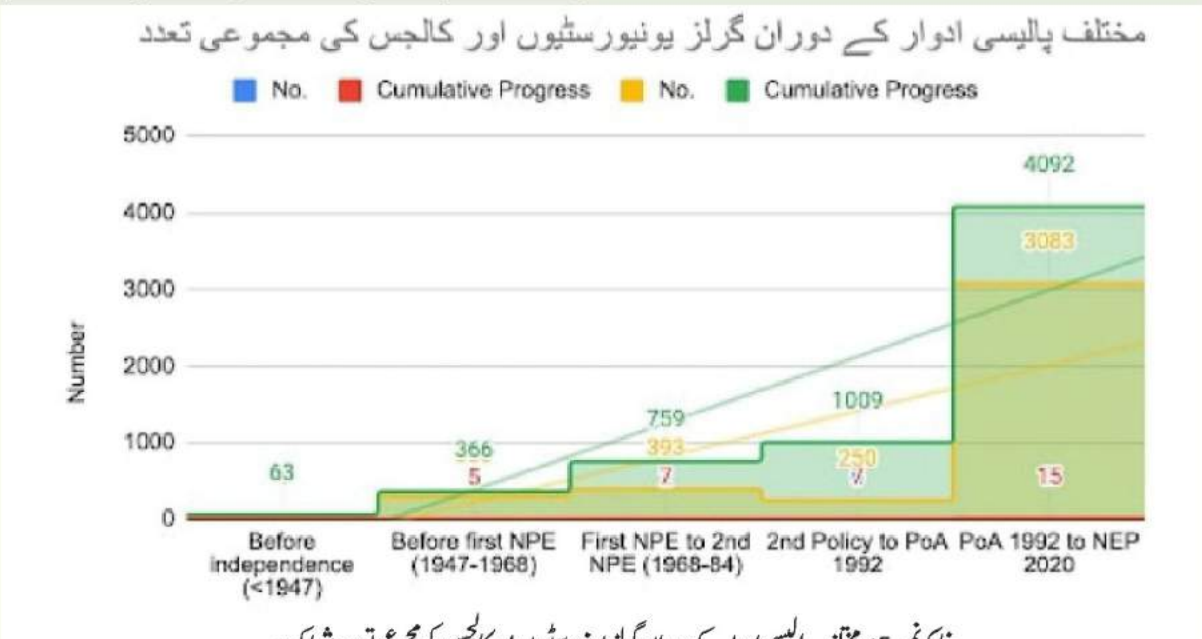

خاکہ نمبر 5: مختلف پالیسی ادوار کے دوران گرلز یونیورسٹیوں اور کالجس کی مجموعی تعدد و شراکت

1009 (24.67%)	250	7 (46.67%)	0	2nd Policy to PoA 1992
4092 (100.00%)	3083	15 (100.00%)	8	1992PoA to NEP 2020
	4092		15	Total

ہمارا ملک 1947 میں آزاد ہوا اس کے بعد 3 پالیسیاں آئیں اس دورانیہ میں لڑکیوں کے کتنے کالجز اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اس بات کو جانچنے کے لیے ڈیٹا کا تجزیہ کیا گیا۔ حاصل شدہ ڈیٹا کی اجتماعی تعدد و فیصد کو جدول میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ خواتین سے متعلقہ یونیورسٹیوں و کالجز کا قیام دوسری پالیسی کے پلان آف ایکشن کے بعد ہی ہوا اور اس دوران یعنی 1992 سے 2020 تک خواتین سے متعلق یونیورسٹیوں کی تعداد 46.67% سے 100% تک پہنچ گئی جب کہ کالجز کی تعداد میں 24.66% فیصد سے 100% تک اضافہ ہوا۔ یہ کوششیں تعلیم میں مساوات کے فروغ کے اقدام کو ظاہر کرتی ہیں۔ El Baradei (2010) کی تحقیق کا محاصل ہماری اس تجزیہ کی حصولیابی کے عین مطابق ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ 1960 کی دہائی سے، مصر نے اعلیٰ تعلیم تک رسائی میں مساوات کو بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستانی کوششوں کو اس کی آزادی کے بعد خاص طور پر پلان آف ایکشن، 1992 کے بعد دیکھا جاتا ہے، جب 97% سے زائد اداروں کے قیام ہوئے۔

نتیجہ

اس مطالعہ سے بہت ساری نئی معلومات حاصل ہوئیں اور نئے زاویہ ابھر کر آئے جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ خواتین کی خواندگی مردوں کے مقابلے میں کم ہے، اس لیے ایسی اسکیموں کی ضرورت ہوگی جس سے خواتین کی خواندگی اور کل ملا کر ان کی تعلیم میں سدھار پیدا کیا جا سکے۔ خواتین کے لیے مختص اداروں کی تعداد بہت کم ہے، اگر اس میں بہتری لائی جائے تو وہ لڑکیاں بھی پڑھنے کی طرف راغب ہوں گی جو پردہ کرتی ہوں یا روایات کی بنیاد پر مردوں سے الگ رہتی ہوں۔ کالجز میں خواتین اساتذہ کی تعداد مردوں کے مقابلے میں اطمینان بخش ہے، جبکہ یونیورسٹیوں میں اس میں بہتری لانے کی گنجائش ہے۔ ریگولر کالجز میں لڑکیوں کا داخلہ لڑکوں کی بہ نسبت بہتر ہیں، البتہ یونیورسٹیوں میں ریگولر اور فاصلاتی دونوں نظاموں میں اس میں بہتری لانے کی گنجائش ہے۔ پلان آف ایکشن 1992 کے بعد تعلیم نسواں کے لیے نئے ادارے قائم ہوئے، اس لیے قومی تعلیمی پالیسیوں یا کمیٹیوں کی رپورٹ کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1۔ مردم شماری کا ڈیٹا 2011، گورنمنٹ آف انڈیا

2https ://censusindi a.gov.in/ce nsus.website/data/data-visualizations/PopulationSearch_PCA_Indicators

3. Brock, C., & Cammish, N. (1997). Factors Affecting Female Participation in Education in Seven Developing Countries. Education Research Paper.

4. Buckner, E. (2013). Access to higher education in Egypt: Examining trends by university sector. Comparative Education Review, 57(3), 527-552.

5. El Baradei, M. (2010). Access, equity and competitiveness: The case of higher education in Egypt. Towards an Arab higher education space: International challenges and societal responsibilities, 159-184.

6. Sifuna, D. N. (2006). A review of major obstacles to women's participation in higher education in Kenya. Research in Post-Compulsory Education, 11(1), 85-105.

❑❑❑

Prof. Mushtaq Ahmed I. Patel
Professor of Education
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032
patelmushtaq04@gmail.com,
Mob: 9440028488

اعتراف ہنر

محمد وقار صدیقی

رخسانہ جبین

کی شاعری میں نسوانی مسائل کی عکاسی

اردو میں کلاسیکی شاعری مردوں کے ذریعے ایک عرصۂ دراز سے چلی آرہی ہے، اور مردوں نے اس میں مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے، چاہے امیر خسرو کی ہندوی شاعری ہو یا مسعود سعد سلمان کی ابتدائی فارسی شاعری، سبھی میدان میں ان حضرات نے اپنے شاعرانہ علم کو بلند رکھا ہے، اس کے کافی عرصے بعد جب اردو کے نقوش قائم ہوئے تو بھی مردوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور شاعری کو ایک مستقل صنف بنانے میں اہم کردار ادا کیا، دیکھا جائے تو عورت انسانی تکمیل کی علامت ہے جس کے بغیر دنیا کی چیزوں کا تصور ناقص اور ادھورا ہے، یہاں تک علامہ اقبال نے خود اس کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اس شعر کے حوالے سے دیکھا جائے تو عورت کو مردوں پر ترجیح حاصل ہے۔ اس کے باوجود ان کو صرف گھر کی ذمہ داریوں پر منحصر کر دینا کافی نہیں، بلکہ ان کے یہاں بھی تعلیم کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کی ضرورت اور اپنے مسائل کو بیان کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ خواہ ایک دور ایسا آیا جب عورتوں کو حصولِ تعلیم کی آزادی ملی اور انھوں نے شاعری کے میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کی، اگر ہم خواتین کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلی شاعرہ کی شکل میں 'مہ لقا چندا بائی' کی شاعری نظر آتی ہے اور یہ اپنے وقت کی ایک صاحب دیوان شاعرہ ہیں، جنھوں نے اپنی شاعری میں نسائی اور نسوانی جذبات کو پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ رسالہ ''عصمت'' 1906 میں خواتین کی تخلیقات اور ان کی فکری بصیرت کا پتہ چلتا ہے، ان میں نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں، فاطمہ بیگم، بیگم اختر سہروردی اور شائستہ اکرام اللہ وغیرہ نے اپنی تحریروں سے ایک نسوانی نقوش قائم کیے وہیں شاعری میں زخ ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) کی شاعری اور ان کے بعد رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال کی شاعری، اپنے تمام جذبات کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

اس کے بعد صفی شمیم ملیح آبادی، کنیز فاطمہ جہاں، خورشید بانو وغیرہ کی شاعری اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے مگر ان کی شاعری ہندوستان میں نہیں شائع ہوتی تھی بلکہ کچھ رسالوں میں ان کے تحریری افکار کو جگہ دی جاتی تھی، مگر جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ان شاعرات نے بھی کھل کر شاعری کو فروغ دیا اور نسوانی احساسات کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ ان کے فکر و شعور اور ذہنی ارتقا اور تخیل سے اردو کو بھی روشنی ملی، اگر ہم ماضی قریب سے موجودہ دور کا تجزیہ کریں تو ہم کو خواتین کی ایک جماعت ملتی ہے مگر یہ جماعت بہت طویل تو نہیں کہی جا سکتی ہے، جیسے ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر جیسی بصیرت افروز خواتین کے یہاں شعری

روایات کی پاسداری ملتی ہے، جنھوں نے اپنے مسائل کے ساتھ سماجی خواتین کے مسائل کو بھی بڑی مہارت سے پیش کیا ہے، ان ہی خواتین شاعرات کی شعری وراثت کو بطور امانت اپنی شاعری کے ذریعے ایک مستحکم منزل کی جانب رواں کرنے میں رخسانہ جبین کا نام بہت اہم ہے۔

رخسانہ جبین عہدِ حاضر کی ایک کامیاب شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنی محنت وکاوش سے نئی بلندیوں کو چھوا بلکہ اس کی اعجازی رفعتوں پر مسند نشیں بھی ہیں، جہاں ان کے چاروں طرف ادبی حلقوں میں یہ سورج کی طرح چمک بکھیرتی نظر آتی ہیں تو وہیں یہ اپنی ہمعصر خواتین شعرا مثلاً ترنم ریاض، صاحبہ شہریار، پروین راجہ، نصرت آرا چودھری، سیدہ نسرین نقاش، شبنم عشائی وغیرہ میں ممتاز نظر آتی ہیں اور مذکورہ خواتین شعرا کے یہاں عورتوں کے مسائل کی ترجمانی کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے۔

رخسانہ جبین کی شاعری میں کشمیر کی آب وہوا، وہاں کی تہذیب وثقافت کا صاف طور پر اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی شاعری فکریہ اور پیغمبرانہ ہونے کے ساتھ اصلاحی پہلو اور اخلاقی درس کا نمونہ بھی ہے، کشمیر کے ماحول کی طرح یہاں شادابی، منظر نگاری، سانسوں کے ذریعے روح کو تازگی دینے والی خنک ہوائیں حدِ نگاہ تک پر کیف سما، ہر سمت جشن و مسرت کا ماحول، اور وہاں کے پھولوں سے دماغ کو معطر کردینے والی خوشبوؤں کے ساتھ دماغ کو جھنجھوڑنے والے مسائل بھی اپنی حجابی غمازی کرتے ہیں، یہ نہیں کہ جہاں ہر جگہ چمن زار گلستاں ہو رنگا رنگی ماحول ہو اور ہر سمت پیڑ پودوں پر خوشنما بلبل اپنی سریلی اور دلکش آوازوں سے گیت و نغموں سے ایک الہامی کیفیت طاری کررہی ہو وہاں پر صرف خوشیاں ہوں، بلکہ یہاں بھی عام جگہوں کی طرح پریشانیاں ہیں یہاں بھی عام خواتین کی طرح خواتین کے مسائل ہیں۔

یہ معاشرے میں ایک نئی کرن کی خواہاں ہیں جہاں عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے ان کے گھروں میں ان پر جوظلم زیادتیاں ہو رہی ہیں اور وہ چہرے جو نقاب میں پوشیدہ ہیں ان کے مسائل اور مکمل نسوانی سماج کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے، کیونکہ عورت میں صبر اور برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، بظاہر گھروں کے مقابلے وہ چہرے عوامی معاشرے میں مسکراتے ہوئے ضرور ملیں گے جنھیں گھروں کے اندر صرف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنی بے باک شاعری میں رخسانہ جبین نے ایسے موضوعات کو پیش کیا ہے۔

نسوانی مسائل کا اظہار مردوں کے یہاں جگہ نہیں پاتا اور ان کے یہاں وہی کلاسیکی محبوب کی ساعدِ سیمیں، لب و رخسار، عارض وگیسو کی خوبصورت باتیں ہوتی ہیں، تو کیا مردوں کو نہیں پتہ ہے کہ جس لب ورخسار کی وہ باتیں کررہا ہے وہ یہی نسواں ہیں اور یہی خاتون ہیں، مگر اس کے باوجود مردوں نے سماجی عورتوں کا تصور الگ اور محبوب کا تصور الگ الگ قائم کیا، اسی وجہ سے جب رخسانہ جبین جیسی ہونہار خاتون شاعرہ نے جنم لیا اور ان کے اندر فکری بصیرت نے تربیت پائی تو سوجھ بوجھ رکھنے والی اس شاعرہ نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی زندگی میں روزمرہ میں پیش آنے والے مصائب کو اپنے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کیا۔ اس کا احساس ان کے ذیل کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے:

میں ہوں تو کوئی بتلائے ہاں ہوں
صدا تو دے کہ جانوں میں کہاں ہوں
یہی فرق ہے مجھ میں اور اس میں
یقیں ہے وہ تو میں بس اک گماں ہوں
زمیں سے آسماں تک شور کیسا
تو کیا سب کے لیے بارِ گراں ہوں
بہم اس کو فضائے آسمانی
میں گویا بند کمرے میں دھواں ہوں
میں پھوٹی اس کی پسلی سے تو ٹیڑھی
وہ سیدھا تیر جیسا میں کماں ہوں
خیال و خواب ہے وہ آبِ دریا
ترے صحراؤں میں ریگ رواں ہوں
کبھی الزام لگتا ہے یہ ہونا
نہ ہوکر بھی تو میں تہمت بجا ہوں
دلیلیں ڈھیر ساری تو زمیں ہے
بہ ضد اس پر کہ تیرا آسماں ہوں

فرسودہ سماج میں یہ ایک ستم خوردہ عورت ہوکر سارے مظالم کو برداشت کر کے اور گھروں میں رہ کے مردوں کے سارے مسائل کو بخوبی انجام دینے اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں دیکھنے کے بعد بھی اپنے وجود کے لیے ترس رہی ہے، یہ اپنے پہلے شعر میں ایک سوال کرتی ہیں کہ جس کو خدا نے آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا اور اسکے ذریعے اس عالم کو ثبات اور نسلِ انسانی سے آراستہ کیا۔

آج وہی ذات اپنی نحیف ونزار آواز میں کہتی ہے کہ کوئی بتائے کہ میں کہاں ہوں، میں کون ہوں، اور کوئی صدا تو دے تاکہ مجھ کو یہ احساس ہو جائے کہ میری بھی سماج میں کوئی عزت ہے، کوئی مجھ سے بھی محبت کرنے والا ہے، کوئی میرا بھی غمگسار ہے، مگر اس کو (مردوں) کو یہ گمان ہے وہ آسمان

ہیں اور میں بند کمرے (حقیر دنیا) میں ایک دھواں ہوں، جو کچھ دور چل کر ہواؤں میں تحلیل ہو جاؤں گی اور اپنا وجود کھو دوں گی، میں اس کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں اس لیے انسان تیر جیسا ہے اور میں کمان کی طرح ٹیڑھی ہوں، مگر ان کو یہ نہیں پتہ کہ بغیر کمان کے تیر کا وجود بے معنی ہے، اور عورت ہی ایک ایسی ذات ہے جس نے ہمیشہ بڑے بڑے مسائل میں مردوں کی حوصلہ افزائی کی ہے چاہے وہ میدانِ کارزار ہو یا کوئی گھریلو پیچیدگی ہو، جہاں مرد کم ہمت اور پست نظر آتا ہے تو ان کے اندر اسی ستم خوردہ عورت نے ہمت پیدا کی ہے، مگر انسان اتنا بے حس و ناکارہ ہے کہ وہ بضد ہے کہ اپنی خوباں صفات میں، مگر رخسانہ کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے جو دنیا کے مردوں کے لیے سبق آموزی سے کم نہیں جہاں کہتی ہیں، جہاں بڑے تو کہتے ہی ہیں مگر وہ بچے جن کو شعور نہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ جنت ماں کے پاؤں تلے ہے:

یہ دنیا دار بچے جانتے ہیں
مرے قدموں میں جنت ہے کہ ماں ہوں

ماں کا درجہ اس دارِ فانی میں سب سے بڑا اور سب سے اہم ہے، کیونکہ جب خدا نے کہہ دیا کہ جنت ماں کے پیروں تلے ہے اور یہ ماں کسی نہ کسی صورت میں وہی ستم خوردہ عورت ہے جس کو سماج میں حقیرانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر عورت کے بلند مقامی کا اور کیا ثبوت دیا جائے اور وہ لوگ جن کی نظروں میں عورتوں کی کوئی اہمیت نہیں وہ بھی ایک عورت کا مقام دیکھ لیں کہ کتنا ارفع و اعلیٰ ہے۔

عورتوں کی گود وہ گود ہے جس میں تمام انبیاء، اولیا، صلحا، شہدا اور بزرگانِ دین نے جنم لیا، اور ان حضرات کا سب سے پہلا گہوارۂ زربفت ماں کی گود ہی رہا ہے اور یہی ماں کی گود تربیت کا سب سے بڑا مدرسہ بھی ہوتا ہے، جو لوگ عورتوں کی ذات سے نفرت کرتے ہیں ان کو سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو جنم دینے والی ایک عورت ہی رہی ہے، یہ مردوں کو اپنی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے خود کہتی ہیں:

ہمارے خواب عجب کہکشاں بناتے ہیں
زمیں کو تاروں بھرا آسماں بناتے ہیں

اپنی ایک اور غزل میں اپنی عظمت کا اعتراف کراتی ہیں:

بے خیالی میں جو کبھی میں نے پکارا سورج
پھر ہوا یوں کہ سوا نیزے پہ اترا سورج
اس نے ماحول بنایا تھا اندھیروں کے لیے
میرے ہاتھوں تو فقط دفن ہوا تھا سورج
رات کے پچھلے پہر کوئی دعا مانگی تھی
یخ زدہ گھر کے کسی کونے سے ابھرا سورج
ناؤ کاغذ کی جو پانی میں اتاری میں نے
پھر دھنک نے بھی انگڑائی، نہایا سورج

ان اشعار کے ذریعے اپنی نسوانی سوچ کی عکاسی کی ہے، رخسانہ جبین کی شاعری میں معنوی تہہ داریاں ہیں یہ دماغ کو کھلا نہیں چھوڑتی بلکہ ایک معنوی عمارت کی تعمیر کراتی ہیں، ان کے یہاں فکر ہے، سوچ ہے، تخیل کی وادیاں ہیں، جو ان کی فنی معراج کی دلیل ہیں، جو سخن فہمی اور سخن سازی کی علامت ہیں۔ ان کا کوئی بھی شعر معنی سے خالی نہیں ہے۔ ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی نصیحت آمیز پیغام ضرور ملتا ہے اور یہی ناصحانہ اور

موعظانہ درس ان کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

رخسانہ جبین مردوں کے تعلق سے کہتی ہیں کہ عورت اپنے شوہر کی لاکھوں باتیں سنتی ہے اور گھروں میں لعنت وملامت کا شکار ہوتی ہے مگر اس کے باوجود عورت صرف صبر کرتی ہے، اور یہ بھی سوچتی ہے کہ گھر کے معاملات گھر میں ہی رہیں، اس کے برعکس اگر عورت سے ذرا بھی کوتاہی ہوجائے یا کسی کام میں تاخیر ہوجائے تو مرد فوراً اس پر جابرانہ انداز میں برس پڑتا ہے، گرچہ عورت کو بیک وقت کئی شغل ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ عورت سماج میں سب سے پسماندہ سمجھی جاتی ہے ،خدا جانے یہ مردوں کی کیسی سوچ ہے جس سے آئے دن نہ جانے کتنی زندگیاں برباد ہوتی ہیں، مندرجہ بالا باتوں کو اگر ذرا بھی سوچ لیں جائے تو معاشرے کی اصلاح ہوسکتی ہے، مذکورہ مسائل کے تعلق سے کہتی ہیں:

میں بھول جاتی ہوں ان کی کہانیاں کتنی
ذرا سی بات کو وہ داستاں بناتے ہیں

اس کی مثال یہ ان پرندوں سے دیتی ہیں جو مل جل کر ہر موسم میں ایک خوبصورت گھر کی تعمیر کرتے ہیں اور ہمیشہ ان کا گھر نئے شجر پر ہوتا ہے ،جہاں نہ کوئی پریشانی ہے نہ تکلیف ہے، اور یہ پرسکون طریقے سے اپنی زندگی جیتے ہیں، ان پرندوں کو دیکھ کر رخسانہ جبین کو رشک آتا ہے اور کہتی ہیں:

نئی رتوں میں پرندے نئی امنگ کے ساتھ
نئے شجر پہ نیا آشیاں بناتے ہیں

ان پرندوں کی زندگی کو دیکھ کر رخسانہ جبین کو رشک آتا ہے اور کبھی کبھی جب انسان حد سے زیادہ پریشان ہوجاتا ہے تو یہاں تک بھی کہہ دیتا ہے کہ کاش میں چڑیا ہوتا یا اور دیگر کوئی غیر ذی العقول چیزوں کو خود پر ترجیح بھی دیتا ہے، یہ سب ان مسائل کی وجہ سے ہوتا ہے جن کی وجہ سے ایک طبقہ پریشان ہوتا ہے اور اس کا سماج میں کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا اور وہ خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

وقت کی تبدیلی کے ساتھ سماج میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں، لیکن جب اس سماج میں کوئی باشعور باسلیقہ باکردار کمزوروں کا ہمدرد اور مسیحا پیدا ہوتا ہے جہاں سماج کے بے بسوں اور بے کسوں کو مشقِ ستم بنایا جاتا ہے، تب سماج کے اس جابرانہ نظام کے خلاف اس کی آواز اٹھتی ہے، زمانے کے لمبے عرصے کا کرب جھیلنے کے بعد رخسانہ نے اپنی شاعری کے ذریعے سماج کو نیا پیغام دیا، کسی شاعر نے عورت کے تعلق سے کیا خوب کہا ہے:

وفا کا حسن ذہانت کا نور ہو جس میں
وہ اک دلہن کئی نسلیں سنوار سکتی ہے

اسی طرح دیکھا جائے تو رخسانی جبین کے خیالات میں وفا کا حسن اور ذہانت کا نور دونوں موجود ہیں اور اسی ذہانت کے نور سے سماج کی غیر منصفانہ تاریکیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور سماج میں عورتوں کے خلاف ایک مہم چلا کر ان کو سماج میں ایک مقام دینے کی کوشش کرتی ہیں اور یہ بھی باور کراتی ہیں کہ سماج میں کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں ہے، اگر کوئی موازنہ کرتا ہے اور خود کو بڑا بتانے کی کوشش کرتا ہے تو رخسانہ جبین فوراً اس پر سوال اٹھاتی ہیں۔

رخسانہ جبین نے اپنی شاعری میں ہر طرح کے موضوعات کو جگہ دی ہے، مگر یہاں ان کی غزلوں میں ان پہلوؤں کو روشن کیا گیا ہے جہاں عورت کو مجبور اور محکوم سمجھا جاتا ہے، ورنہ ان کی شاعری کی دنیا بہت طویل ہے۔ جہاں سیاست بھی ہے عقیدت بھی ہے، دور اندیشی اور دور بینی کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں، ان کے یہاں لفظوں کا برمحل استعمال ہوا ہے اور یہ ایسی تعقیدِ لفظی سے گریز کرتی ہیں جہاں شعر پہیلی بن جائے، سادہ سلیس شاعری میں ان کی باتوں کی ترسیل بڑی آسانی سے ہوتی ہے، تشبیہ استعارہ کے ساتھ ان کے یہاں علامتی نقوش بھی ملتے ہیں جو ان کو شاعری کو دنیا میں حیاتِ جاودانی کی سند سے سرفراز بھی کرتے ہیں۔

بہتر شاعر یا مصنف وہی ہوسکتا ہے جو اپنے اردگرد کی چیزوں پر نظر رکھے اور اس میں بھی صداقت وسچائی سے کام لے کر اس کی ترجمانی اپنے پاکیزہ خیالات کے ذریعے بیان کرے، ان کے یہاں کوئی بھی پہلو خیالی نہیں جو صرف لوگوں کو سرور مستی دیتی ہو۔ ان کی شاعری میں لیلیٰ ومجنوں، شیریں وفرہاد، نل ودمن، الف لیلیٰ، علی بابا اور حاتم طائی کے خیالی اور داستانی قصے نہیں ہیں بلکہ ان کی شاعری میں روزمرہ کے تجربات و مشاہدات ہر قدم پر ملتے ہیں۔ یہ جموں کشمیر کی معتبر اور مستحکم شاعرہ ہیں اور کشمیر کی خوشنما وادیوں سے اس طرح کے مسائل سے پردہ اٹھانا جس کو دنیا ایک خوبصورت اور عارضی جنت تسلیم کرتی ہو، وہاں جس طرح کے مسائل سے ایک کمزور نسوانی طبقہ دوچار ہے اس کی عکاسی کرنا اور حقیقت بیان کرنا رخسانہ جبین کی شاعری کا خاصہ ہے۔

□□□

Mohd. Waqar Sadeeqi
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

شیبا کوثر

''نئی صبح'' (نظم)

یہ موسمِ خزاں ہے
بیت جائے گا
موسم بدلتا ہے
بدل جائے گا
انتظار کرو بہار کا دن
پھر آئے گا
پھر نئے پتے
شاخوں پر اُگیں گے
پھر سے درختوں پر ثمر آئے گا
پھر چلے گی بادِ بہاراں

پھر خوشبو لیے وہ گھر آئے گا
گھر کا کونہ کونہ خوشبو سے
معطر ہوگا
روح کو تسکین دینے
جب وہ ادھر آئے گا
بچوں کے لب پہ پھر سے
مسکراہٹیں کھیلیں گی

جب کوئی بچھڑا ہوا
نظر آئے گا
چلو پھر کیوں نہ انتظار کریں
شور کیوں ہم سرِ بازار کریں
چلو چلو پھر اپنے چمن کو چلیں
دل میں سکون لیے شہرِ امن کو چلیں
جہاں نہ غم کا کوئی ڈیرہ ہوگا
نئی صبح ہوگی
خوشیوں کا سویرا ہوگا۔

Sheeba Kausar
Mohalla: Brah batrah
Arrah-802301 (Bihar)
Mobile: 6201624363
E mail: sheebakausar35@gmail.com

رخشاں ہاشمی

غزلیں

اتنا کہ ہم کو منائے ٹھیک سے
اس سے ہم نہ روٹھ پائے ٹھیک سے

دل کے روشن دان سے تکنے لگا
کھڑکی دروازے لگائے ٹھیک سے

کیا ہوا جو خالی ہاتھوں آئے ہو
شکر ہے تم لوٹ آئے ٹھیک سے

چودھویں کی شب مہ کامل ہوا
روشنی میں ہم نہائے ٹھیک سے

آنکھ سے رخشاں وہ اوجھل ہو گیا
ہم زیارت کر نہ پائے ٹھیک سے

مزیّن شامِ غم ہونے لگی ہے
جو میری آنکھ نم ہونے لگی ہے

خبر آنے کی اس کی جب ملی تو
گلی میری ارم ہونے لگی ہے

بہت تھوڑا مجھے جینا ہے شاید
محبت اس کی کم ہونے لگی ہے

وہ میرے ساتھ کیا چلنے لگے ہیں
خوشی ہر اِک قدم ہونے لگی ہے

ہے رخشاں جاں نثاری کا یہ منظر
ندی دریا میں ضم ہونے لگی ہے

Rakhshan Hashmi
Hashmi Maskan
Shah Zubair Road, Rizvi Colony
Munger-811201 (Bihar)
Mob :9304342562

کہانیاں

سلمیٰ صنم

دیوی

مندر میں دیوی درشن کرتے ہوئے دیپا نے دیکھا۔

وہ کوئی سولہ۔۔سترہ سالہ لڑکا تھا۔مدقوق جسم، خارش زدہ، بدبودار، کانپتا،لرزتا، دھواں دھواں چہرہ، منہ میں جھاگ، آنکھوں میں آگ

"لڑکے پر اماں کا سایہ ہے۔بڑے پجاری مہاراج نے اس کی ماں سے کہا"اس کو ساڑی پہنا دو گلے میں متھو باندھ دو"۔ہائے اس عورت نے یہ کیا سن لیا تھا۔وہ سناٹے میں آگئی۔اس پر زلزلے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پجاری مہاراج کی جانب دیکھا اور پھر غش کھا کر دیوی کے قدموں میں جا گری۔

"اماں شکتی مان ہے۔یہ اس کی لیلا ہے کہ وہ مرد کو عورت بنا دیتی ہے"۔مہاراج کہہ رہے تھے۔

دیپا پلٹ آئی۔جانے ساگر کہاں تھا۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔مندر میں بھکتوں اور سیاحوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔آگہن کا مہینہ تھا۔سون دتی (بلگام۔کرناٹک) سے تین میل دور ملا پر بھاندی پر جھکے ہوئے سدھانچل پہاڑ کی چوٹی پر واقع یلما دیوی مندر کا جاترا قریب تھا۔وہ ایک جرنلسٹ تھی اور اپنے ساتھی جرنلسٹ دوست ساگر کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

بھیڑ سے خود کو بچاتے ہوئے۔دور تک چلتے ہوئے اس نے دیکھا ساگر جوگپا س کے ایک جھرمٹ میں کھڑا ہے۔

'شاید ان کا انٹرویو لے رہا ہو۔اس نے سوچا کم بخت ہے بھی تو بلا کا ذہین اور مضامین بھی کس قدر خوبصورت لکھتا ہے۔اس کی نثر میں تو غضب کی روانی ہے۔کیا ہوا شکل سے تھوڑا فیمیل لگتا ہے مگر ہے بڑا اسمارٹ' وہ ساگر سے خاصی متاثر تھی۔شاید اس کو چاہتی بھی تھی۔بارہا ساگر سے اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا تھا مگر وہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کو خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔بس وہ تھا اور اس کا قلم۔اب ایسی بھی کیا سرد مہری۔

وہ قریب پہنچی تو ساگر اس کی طرف گھوما

"مجھ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔۔۔کیوں؟"

"ہاں"

"ان سے ملو یہ ناگما، شروتی، دیوی، پدما۔۔۔۔"
وہ ان سب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔رنگ برنگی ساڑیوں میں ملبوس، ماتھے پر ہلدی، کم کم، گلے میں متھو، ہاتھوں میں ہرے کانچ کی چوڑیاں اور داڑھی مونچھ سے عاری کرخت چہرے۔۔
"یہ جوگپاس ہیں۔"
دیپا ایک ایک کا چہرہ تکتی رہی۔ساگر کی تحریروں میں تو انھیں دیکھا تھا مگر یوں جیتے جاگتے، دھڑکتے سانس لیتے پہلی بار دیکھ رہی تھی
شام دھیرے دھیرے مندر میں اتر رہی تھی اور اس کے دھاندلیوں میں کچھ جوگپاس چوڑکی، ستی اور تال بجانے لگے۔کچھ گانے لگے ساتھ ہی نرتیہ کرنے لگے۔وہ اپنی دھن میں مست تھے خوش تھے اور اپنی دیوی کو خوش کرنے کے لیے گا رہے تھے ناچ رہے تھے اور شام کے دھندلکوں میں یوں جھومتے گاتے وہ کسی اور جہاں کی مخلوق نظر آرہے تھے۔
ساغر انھیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے ان سے کوئی گہرا لگاؤ ہو۔"یہ شہر یہ مندر یہ لوگ۔۔۔میں یہیں پیدا ہوا اسی مٹی سے۔میں یہاں کبھی کچھ لکھنے کے خیال سے نہیں آیا۔بس یہاں کا ماحول مجھے بار بار اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور یہ جوگپاس جیسے یہ مجھے بلا رہے ہو۔تمھیں آنا ہوگا۔۔۔تم آؤ۔۔"
"یہ جوگپاس بھی عجیب مخلوق ہیں۔۔پتہ نہیں کیوں ہیں" وہ بولی تو ساگر تڑپ کر بولا" کیوں ان کے ہونے میں کیا برائی ہے"
"برائی تو نہیں" دیپا اس کو تڑپتا دیکھ کر حیران ہوئی۔
" مگر پھر بھی۔۔۔"
"ان کے ہونے میں ایک کہانی ہے۔جو پرانوں میں لکھی ہے۔"
اور پھر ساگر جوگپاس کے وجود میں آنے کی وہی کہانی سنانے لگا جو وہ اس کے مضامین میں پڑھ چکی تھی۔وہ کہانی کہتا رہا وہ سنتی رہی۔پھر جب ساز بجنا بند ہوگئے۔گیت رک گیا۔تھرکتے پیر تھم گئے تو ساگر ان کی جانب لوٹ گیا۔اور ان میں یوں گھل مل گیا جیسے وہ ان ہی میں سے ایک ہو۔ان ہی کا کوئی حصہ ہو۔۔دیپا کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی۔
وہ جوگ لے رہے تھے۔شردھالو انھیں ان، استر تھے اور روپیہ دان کرر ہے تھے۔ان کا آشیرواد لے رہے تھے۔۔پن کام رہے تھے۔سب کا عقیدہ تھا کہ جوگپاس شردھالو اور دیوی کے درمیان ایک کڑی ہیں کیونکہ وہ خود نہیں آتے تھے۔دیوی انھیں بلاتی تھی۔اپنی سیوا کے لیے جگت سیوا کے لیے۔دکھیاروں کے کام آنے کے لیے۔وہ پوتر تھے پاک تھے غریب تھے مگر پھر بھی اپنے آپ میں خوش تھے۔مست و مگن تھے۔وہ بھیک نہیں جوگ لیتے تھے اور سب کو دعائیں دیتے تھے۔

دیپا نے ہر ایک سے ملاقات کی۔ان کی کہانی سنی اپنی رپورٹ میں انھیں شامل بھی کیا۔اس نے ساگر سے پوچھا" یہ جو تقدیس کا ہالہ انھوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے تمھیں کیا لگتا ہے یہ حقیقت ہے یا ایک افسانہ"

> یہ حقیقت ہے دیپا یہ کھرے لوگ ہیں سچے اور پوتر انھوں نے کوئی مکوٹھا نہیں چڑھایا ہے۔کوئی دوسرا چہرہ نہیں لگایا ہے۔اور ادھر ہمیں دیکھو ہم جو مہذب ہیں۔تعلیم یافتہ ہیں اپنی مرضی کی زندگی جی نہیں سکتے۔ہم دوغلے لوگ ہیں۔اس سماج میں جینے کے لیے مکوٹھے چڑھاتے ہیں۔چہرے پر چہرہ لگاتے ہیں"۔

" یہ حقیقت ہے دیپا یہ کھرے لوگ ہیں سچے اور پوتر انھوں نے کوئی مکوٹھا نہیں چڑھایا ہے۔کوئی دوسرا چہرہ نہیں لگایا ہے۔اور ادھر ہمیں دیکھو ہم جو مہذب ہیں۔تعلیم یافتہ ہیں اپنی مرضی کی زندگی جی نہیں سکتے۔ہم دوغلے لوگ ہیں۔اس سماج میں جینے کے لیے مکوٹھے چڑھاتے ہیں۔چہرے پر چہرہ لگاتے ہیں"۔
یہ ساگر نہیں کوئی اور تھا جو اس کے اندر سے بول رہا تھا۔دیپا کو لگا ساگر بدل گیا ہے یہ وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتا ہے یہ تو کوئی اور ہے۔آج کل وہ خوب پھیل رہا تھا۔اپنے اندر بہت کچھ سمیٹ رہا تھا۔اس کے اندر اتنا شور نہیں تھا۔اتنے جذبے نہیں تھے۔احساس کا اتنا بوجھ نہیں تھا۔
"میرے والد بہت سخت گیر تھے انھوں نے مجھے وہ بننے نہیں دیا جو میں بننا چاہتا تھا۔میں کبھی خوش نہیں رہا۔کبھی مطمئن نہیں رہا۔مگر اب نہیں دیپا اب ایسا نہیں ہوگا۔"
جیسے وہ کسی اور ہی جہاں میں گم تھا۔
اب کیا ہوگا۔۔دیپا نے سوچا۔۔کوئی نئی بات کوئی نئی زندگی۔کیا ساغر میرا ہو جائے گا۔
بڑی مضحکہ خیز سچوئشن تھی۔ساگر رامو کو ساڑی پہننا سکھلا رہا تھا۔دیپا کو ہنسی آگئی۔
"ہنس کیوں رہی ہو۔" وہ خفا ہو گیا.
"جوگپاس کے بارے میں لکھتے ہوئے یوں لگ رہا ہے تم بھی ایک

جوگیا بن گئے ہو۔"

"کیا"؟؟ ایک پل کو ساگر یوں لرزا کہ دیپا حیران رہ گئی۔

" ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔" اس کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دیپا نے تشویش بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا" تم نے اتنی سنجیدگی سے کیوں لے لیا"۔

مگر وہ فوراً ہی نارمل ہو گیا۔

رامو کافی خوش نظر آ رہا تھا اس کی تو شکل ہی بدل گئی تھی۔اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مزدور کا بیٹا ہے۔اس سے بڑی تین بہنیں ہیں۔بہت منتوں مرادوں سے وہ پیدا ہوا تھا اور اپنے غریب والدین کا اکلوتا سہارا تھا۔پچھلے سال جانے کیسی بیماری لگی اسے کہ کسی حکیم ڈاکٹر کا علاج کام نہ آیا۔سب نے مشورہ دیا کہ دیوی کے مندر جاؤ۔۔اور بس یہاں آتے ہی اسے شفا مل چکی تھی۔

آگھن کے پورے چاند رات کو کڑکڑاتی سردی میں جوگلو باوی کے ٹھنڈے پانی سے نہا کر زرد ساڑیوں میں ملبوس، گلے میں کانوں میں کوڑیاں سجائے، ماتھے پر ہلدی کم کم لگائے،سروں پر پھول کی لکڑیوں سے لپٹی ٹوکریاں اٹھائے وہ خراماں خراماں مندر کی جانب یوں آرہے تھے جیسے کسی اور دنیا کے باسی ہو۔ان کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے شاید ان کے رشتہ دار ہوں۔

آج یلما دیوی کا جاترا تھا۔ساگر نے اسے بتایا تھا کہ آج ہی رات نئے نئے جوگپا یا جوگتی بنائے جاتے ہیں۔وہ سیدھے بڑے پجاری مہاراج کے پاس آئیں گے جو انھیں ان کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ان سے حلف لے گا کہ وہ سماج سیوا کریں گے۔اس کے بعد وہ جوگ نرتیہ کریں گے۔

"اماں کی لیلا ہے" وہ بولا تو دیپا اس کا چہرہ تکنے لگی۔کہتی بھی کیا؟؟۔یہ تبدیلی تو واقعی حیران کن تھی۔

آگھن کے پورے چاند رات کو کڑکڑاتی سردی میں جوگلو باوی کے ٹھنڈے پانی سے نہا کر زرد ساڑیوں میں ملبوس، گلے میں کانوں میں کوڑیاں سجائے، ماتھے پر ہلدی کم کم لگائے،سروں پر پھول کی لکڑیوں سے لپٹی ٹوکریاں اٹھائے وہ خراماں خراماں مندر کی جانب یوں آرہے تھے جیسے کسی اور دنیا کے باسی ہو۔ان کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے شاید ان کے رشتہ دار ہوں۔

آج یلما دیوی کا جاترا تھا۔ساگر نے اسے بتایا تھا کہ آج ہی رات نئے نئے جوگپا یا جوگتی بنائے جاتے ہیں۔وہ سیدھے بڑے پجاری مہاراج کے پاس آئیں گے جو انھیں ان کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ان سے حلف لے گا کہ وہ سماج سیوا کریں گے۔اس کے بعد وہ جوگ نرتیہ کریں گے۔

وہاں لوگوں کی ایک بھیڑ اکھٹا تھی۔جاترا پر آئے ہوئے شردھالو اور سیاح یہ نظارا دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔کچھ منچلے ان جوگپاس پر پھبتی کس رہے تھے۔کچھ سیٹیاں بجا کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔کچھ نازیبا فقرے بھی اچھال رہے تھے مگر وہ تھے کہ سب سے بے نیاز ایک جذب کے عالم میں یوں چل رہے تھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت انھیں مل گئی ہو۔

بھیڑ سے خود کو بچاتے ہوئے دیپا اپنے موبائل سے ان کا ویڈیو بنا رہی تھی کہ اچانک وہ سامنے آ گیا۔وہ ساغر ہی تھا رامو کے ساتھ مگر اس کا یہ حلیہ۔

"یہ کیا مسخرا پن ہے "وہ چڑ گئی" تم یہاں کیا کر رہے ہو"۔

"جو تم دیکھ رہی ہو" وہ کافی مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا

"مطلب"

" دیپا میں وہ نہیں ہوں جو تم نے مجھے اتنا عرصہ دیکھا ہے۔میں یہی ہوں جو اب تمھیں نظر آ رہا ہوں۔آج میں نے کوئی مکھوٹا نہیں لگایا ہے۔یہ میرا اصلی چہرہ ہے"

دیپا کو لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے اور یلما دیوی چوٹی سے نیچے ملا پر بھاندی میں جا گری ہے۔۔!!!

□□□

Salma Sanam
C/O Muslim Library
8, Upstairs, Veerapillai Street
Shivajinagar
Bangalore 560001 (K.S)

وفا کی تلاش

نزہت نبیلہ

میں کل کی فلائٹ سے آ رہا ہوں.... جس روپ میں تمھیں چھوڑ گیا تھا لوٹ کر تمھیں اسی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں .... بس آج انتظار کا آخری دن ہے .... کل میں تمھارے پاس .... میرے استقبال کی تیاری میں لگ جاؤ .... وہ جانے کیا کیا کہہ گیا اس نے شرما کر موبائل ہی بند کر دیا ....

اسد درانی کے آنے کی خبر سے گھر میں خوشی کی ہلچل سی مچ گئی.... ماما ....پاپا مہوش، اوس انس مہوش سب کے سب مہ رشتہ داروں کو خبر دے رہے تھے۔ اس نے بھی پاپا ممی اور بھائی جان کو اسد کے آنے کی خبر دے دی تھی۔

کوٹھی کو دلہن کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

وہ خود سے اسد کی پسند کی ڈیش تیار کر رہی تھی بار بار ماما اور مہوش سے مشورے بھی لے رہی تھی بار بار کچھ منگوانے کے لیے ظہور بابا کو پاس کی دکان میں بھیج رہی تھی۔ کیونکہ اکرم کو لے کر پاپا چلے گئے تھے اسد بابا کے آنے کی خوشی میں ظہور بابا اپنی تھکاوٹ بھول گئے تھے۔ اسد کو انھوں نے گود میں کھلایا تھا اسد بابا آ رہے تھے وہ بھی سرحد پر جنگ جیت کے اس سے زیادہ ظہور بابا کے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔

ساری ڈش تیار کر کے فریج میں ڈال دیں۔ پھر عشاء کی نماز پڑھنے اوپر چلی آئی تھی نماز سے فارغ ہوئی تو اسد کا کال آ گیا۔ ساری کارروائی پوری کر کے میں ابھی آ رہا ہوں کافی تھک گیا ہوں صبح پانچ بجے شری نگر کے لیے نکلنا ہے فلائٹ پکڑنے کے لیے کل ملنے پر باتیں ہوں گی ابھی شب بخیر!

فجر کی نماز سے قبل وہ اٹھ گئی تھی۔ نماز اور تلاوت کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے لان میں چلی آئی تھی۔ جہاں رنگ برنگے پھول اپنی خوشبو لٹا رہے تھے.... ہر پھول جیسے اسد کے آنے کی خوشی میں جھوم رہا تھا۔ وہ بھی

جانے کیا سوچ کر مسکراتی رہی۔ اس نے جوہی اور بیلے کے پھولوں سے اپنا آنچل بھر لیا اور واپس لوٹ آئی.... اس نے سارے پھول بستر پر ڈال دیئے اور سب کے ساتھ چائے پینے نیچے چلی آئی۔

پھر پاپا آج کی تیاری کے لیے ظہور بابا کو لے کر گاڑی سے کہیں چلے گئے.... اکرم، بوا اور پنکی اپنے اپنے کاموں میں لگ گئی تھیں۔ مہوش اور انس ابھی جگے نہیں تھے۔ اس لیے وہ بھی اوپر چلی آئی تھی۔

اب اسد ائیر پورٹ پہنچ چکے ہوں گے اس نے یہ سوچ کر اسد کو کال لگایا اس کا Network نہیں مل رہا تھا۔ ابھی پورے پانچ گھنٹے باقی ہیں وقت کٹتے نہیں کٹ رہا تھا۔ تھوڑا آرام کر لیتی ہوں یہ سوچ کر وہ بستر پر دراز ہوگئی اور اسد کے خیالوں میں کھو کر جانے وہ کب نیند کی وادی میں پہنچ گئی .... کافی دیر سوتی رہی تھی۔ آنکھ کھلی تو صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے اسد کو آنے میں ڈیڑھ دو گھنٹے باقی ہیں۔ مجھے اب تیار ہو جانا چاہیے۔

واش روم میں گھس گئی شاور لینے کے بعد اس نے شادی کا لہنگا نکالا جو کافی بھاری تھا۔ لیکن اسد کی ضد تھی کہ وہ شادی کا ہی لہنگا پہنے وہ اسے دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس لیے اسد نے اسے ایئرپورٹ آنے سے صاف منع کر دیا تھا۔

کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کی نظر کا مرکز بنے اس نے لہنگا زیب تن کیا۔ کلائی میں کانچ کی میچنگ چوڑیاں اور سونے کے کنگن بھی ڈالے گلے میں بھاری نکلس پہنا۔ لاکٹ جو اسد نے رونمائی میں دیا تھا وہ ہر وقت اس کے گلے میں موجود رہتا تھا۔ کانوں میں بڑے سے جھمکے اور مانگ میں ٹیکا بھی.... پھر گیلے بالوں میں کلچر لگا کر کھلا چھوڑ دیا اور کلپ لگا کر کر بالوں میں گجرا لگا کر ہلکا پھلکا میک اپ بھی کر ڈالا.... سر پر آنچل سجا کر ایک سرسری نگاہ آئینے پر ڈالی تو وہ اپنا سراپا دیکھ کر خود ہی شرما گئی۔ وہ دلہن ہی تو لگ رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل سے اسد کی تصویر اٹھا کر اس سے مخاطب تھی.... دیکھیے اب کتنی دیر اور آنے میں لگیں گی میں تیار بیٹھی ہوں آپ کے انتظار میں....

اسد کی مسکراتی ہوئی تصویر دیکھ کر اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اسے اسد سے پہلی ملاقات یاد آ گئی؟

جب وہ لوگ دہلی سے (اپنی ماموں زاد بہن کی شادی سے لوٹ رہے تھے۔ غریب رتھ میں ان لوگوں کا ریزرویشن تھا ممی اور بھائی جان ساتھ تھے (پاپا چھٹی نہیں ملنے کی وجہ سے شادی پر نہیں گئے تھے (دو سیٹیں ان کی ایک Upper اور ایک Middle تھی ممی کو جوڑوں کی تکلیف تھی ممی بار بار کہہ رہی تھی کوئی اللہ کا بندہ مل جائے تو سیٹیں بدل لے

سامنے Lower برتھ ابھی خالی تھی ممی وہیں بیٹھ گئیں ایک موٹی عورت ممی کے بغل میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

ٹرین چلنے ہی والی تھی کہ ایک نوجوان بڑا سا ائر بیگ کاندھے پر لٹکائے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹرین چل چکی تھی اور بھائی جان کا پتہ نہیں تھا۔ اسے تشویش ہونے لگی ممی بھائی جان کہاں رہ گئے وہ خوفزدہ سی ہوگئی اور اس کی گھبراہٹ پر نوجوان محظوظ ہو رہا تھا۔

"ارے بیٹا آ رہا ہوگا وہ کوئی بچہ ہے آئے دن سفر کرتا ہے لو وہ آ گیا" "بھائی جان آپ کہاں رہ گئے تھے میں تو ڈر ہی گئی تھی"

اس کی معصومیت پر وہ نوجوان اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا اس نے اچٹتی سی نگاہ سے اس نوجوان کو دیکھا تھا اور پھر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

اب وہ نوجوان ایک دوسرے کے بغل میں بیٹھ گئے تھے۔ اور جوں ہی اس نوجوان نے بھائی جان کی طرف رخ موڑا دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اسد تم؟ عدیل تم؟

اسد تم تو ایسا غائب ہوئے کہ پلٹ کر پوچھا ہی نہیں.... مصباح، عاطف سب تمھارے لیے پریشان تھے.... تمہارا موبائل بھی سوئچ آف آ رہا تھا....؟

اسد درانی نے بڑے ادب سے ان ھیں سلام کیا تھا۔ انھوں نے بھی ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالی تھیں اور یہ میری بہن آیت ہے ممی کے کہنے پر مجبوراً اس نوجوان کو سلام کرنا پڑا تھا جس کا جواب اس نے مسکراتے ہوئے صرف سر ہلاتے ہوئے دیا تھا۔ بھائی جان کے ساتھ ممی بھی اسد درانی کی باتوں میں دلچسپی لے رہیں تھیں۔

ہاں یار تمھاری شکایت درست ہے تمھیں تو معلوم تھا میں اپنے ملک کی خدمت کرنے کے جذبے کو اپنے دل سے کبھی نکال نہیں سکا پاپا، ماما سب کے منع کرنے کے باوجود میں نے فوج کی نوکری کو ترجیح دی میں سب سے چھپ کر فوج کے لیے کام کر رہا تھا.... اور قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میرا سلیکشن فوج میں ہوگیا۔ چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد میری پوسٹنگ ہوگئی اور ان دنوں میں کشمیر کے سرحد پر Posted ہوں اسی بھاگ دوڑ میں خود

کو بھی بھلا بیٹھا تھا۔
پوسٹنگ کو ابھی دو ماہ ہوئے ہیں، پندرہ دنوں کی چھٹی ملی ہے شری نگر سے فلائٹ پکڑ کر دلی آیا تھا۔
میگزین پڑھتے ہوئے بھی اس نوجوان کی آواز اس کے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی۔
عدیل نے اپنی ممی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ممی یہ میرا علی گڑھ کا روم میٹ اسد درانی ہے علی گڑھ کی پڑھائی چھوڑ کر یہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے اور اسے اچھی پوسٹ مل گئی ہے جیسا کہ اسد نے بتایا تھا۔
اسد درانی نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا تھا۔ انھوں نے بھی ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالی تھیں اور یہ میری بہن آیت ہے ممی کے کہنے پر مجبوراً اس نوجوان کو سلام کرنا پڑا تھا جس کا جواب اس نے مسکراتے ہوئے صرف سر ہلاتے ہوئے دیا تھا۔ بھائی جان کے ساتھ ممی بھی اسد درانی کی باتوں میں دلچسپی لے رہی تھیں۔

باتوں کا سلسلہ چلا تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں....اس طرح علی گڑھ اسٹیشن آگیا اسد نے کہا چلو عدیل علی گڑھ اسٹیشن کا لطف اٹھا کر آتے ہیں یہاں سے ہماری بہت ساری یادیں جڑی ہیں۔ چلو حمید میاں کی دکان پر چائے پیتے ہیں جہاں ہمیشہ چائے پیا کرتے تھے۔ دونوں ان کی چائے کی دکان پر پہنچ گئے تھے۔

باتوں کا سلسلہ چلا تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں....اس طرح علی گڑھ اسٹیشن آگیا اسد نے کہا چلو عدیل علی گڑھ اسٹیشن کا لطف اٹھا کر آتے ہیں یہاں سے ہماری بہت ساری یادیں جڑی ہیں۔ چلو حمید میاں کی دکان پر چائے پیتے ہیں جہاں ہمیشہ چائے پیا کرتے تھے۔ دونوں ان کی چائے کی دکان پر پہنچ گئے تھے۔
کہیے بھائی کیا حال چال.... میاں بہت دنوں پر آئے ہیں کیسے ہیں آپ لوگ؟ حمید میاں نے کہا آپ کی دعا ہے بھائی۔ دونوں چائے پینے لگے اور ساتھ ساتھ حمید میاں سے باتیں بھی.... پھر چپس اور آئس کریم لے کر دونوں لوٹے تھے.... اسد نے آئس کریم اور چپس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا لیجیے یہ آپ کے لیے.... جی نہیں شکریہ! اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا.... ارے تکلیف کی کیا بات ہے آپ کے بھائی جان کا خاص فرینڈ ہوں مجھے غیر نہ سمجھیں امی اور بھائی جان کے کہنے پر اسے آئس کریم اور چپس لینی پڑی تھی۔
بیٹا تمھیں کہاں تک جانا ہے؟ ممی نے پوچھا.... ارے آنٹی عدیل نے آپ کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟ آنٹی میں آپ کے شہر پٹنہ کا رہنے والا ہوں ہارون کالونی میں ہمارا مکان ہے۔
میں تو آپ کے گھر سمن پورہ کئی بار جا چکا ہوں اور ہمیشہ چائے ناشتہ کر کے ہی لوٹا ہوں ارے بیٹا باہر کون آتے جاتے ہیں مجھے کیا معلوم؟ اس کے پاپا کے بھی ملنے والے آتے ہی رہتے ہیں اور بیٹا تمھارے گھر میں کون کون ہیں؟
پاپا، ماما، چھوٹی بہنیں اور چھوٹا بھائی....
پاپا کا Export Import کا کاروبار ہے۔
اچھا بیٹا اپنی ماما اور بہن کو لے کر آؤ ہمارے گھر.... ہاں آنٹی ضرور آپ لوگ بھی آیئے ہمارے گھر، ماما آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔
آیت کھانا نکالو .... پھر سونے کی تیاری کرتے ہیں وہ موٹی عورت کھانا کھا کر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ آیت نے پیپر پلیٹ میں کھانا نکال کر سب کو دیا.... نرم نرم پوریاں شامی کباب، مٹر پنیر کی سبزی اور مٹھائی۔
اسد درانی نے کہا تھا اس کے پاس کھانے کی چیزیں موجود ہیں لیکن ممی اور بھائی جان اصرار پر سا ے کھانا پڑا۔ اسد تم اور میں Upper پر آ جاتے ہیں آیت مڈل پر آ جائے گی اور ممی تمھاری سیٹ پر آ جائیں گی کیونکہ جوڑوں کی تکلیف کی وجہ سے ممی کو اوپر چڑھنا مشکل ہو گا۔
ارے اس میں کہنے والی کون سی بات ہے۔ سب نے بستر لگا کر اپنی اپنی سیٹ سنبھالی۔
پٹنہ آنے کے دو گھنٹہ قبل ہی ممی نے سب کو جگا دیا تھا۔ فریش ہونے کے بعد اسد نے پیسٹری نکال کر دی سب نے پیسٹری کے ساتھ چائے لی۔
اسد کے گھر سے ظہور بابا گاڑی لے کر آئے تھے ممی اور عدیل نے کہا تھا کہ وہ لوگ آٹو پکڑ لیں گے لیکن اسد کہاں ماننے والا تھا۔ پہلے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں گا تب ہی گھر جاؤں گا۔
ممی نے گاڑی سے اترتے ہوئے اسے دعا کے ساتھ گھر آنے کی دعوت دی اس نے بھی کہا تھا کہ وہ آتا رہے گا۔
اور دوسرے دن شام میں ہی وہ آ گیا تھا۔
بھائی جان بھی ان دنوں فری تھے۔ انھوں نے دو چار جگہ انٹرویو دے رکھا تھا.... پاپا بھی اسد سے مل کر خوش ہوئے ایک ہی ملاقات میں وہ

بھی اس کے گرویدہ ہو کر رہ گئے تھے تیسرے دن وہ صبح ہی آ پہنچا تھا.... ماما نے میرے آنے کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کر ڈالا ہے میں ماما کی طرف سے آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے آیا ہوں آپ لوگ تیار رہیں گی۔ میں شام میں گاڑی لے کر آجاؤں گا۔ ممی نے کہا تھا عدیل چلا جائے گا لیکن اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ آپ اور آیت کو آنا ہی ہوگا اور شام میں وہ خود گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ اور نہیں چاہتے ہوئے بھی اسے ممی کے کہنے پر جانا ہی پڑا تھا۔

نیلے کلر کا لانگ فراک چوڑی دار میچنگ جیولری اور ہلکے پھلکے میک اپ میں اس کا حسن دمک اٹھا تھا۔ وہ تو اسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

اسد کی ماما بہت گرم جوشی سے ملی تھیں۔ مہوش نے آیت کو دیکھا تو اسے ایسا لگا مانو کوئی آسمانی حور آسمان سے اتر کر زمین پر آ گئی ہو یوں مہوش خود بھی بہت خوبصورت تھی لیکن اس کا حسن آیت کے حسن کے آگے پھیکا پڑ گیا تھا۔

وہ آیت کو ساتھ لیے اپنی دوستوں کے پاس چلی گئی پھر سب سے اس کا تعارف کروایا۔ مہوش کی فرینڈ نے بھی اس کو کافی پسند کیا۔

کم وقفہ میں ہی وہ مہوش کی اچھی دوست بن گئی تھی۔

پارٹی کافی اچھی رہی تھی۔ آیت نے بھی کافی انجوائے کیا.... ممی نے ایک خوبصورت رسٹ واچ اسد کو بطور تحفہ دی تھا۔ پھر اسد ان لوگوں کو چھوڑ گیا۔ پھر ممی نے بھی دو دن بعد ان لوگوں کی دعوت کر ڈالی تھی۔ وہ پیسے والے لوگ تھے لیکن ان لوگوں میں غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

وہ ہر شام آتا گھنٹوں بیٹھ کر گپیں مارتا ممی کے ہاتھوں کی گرما گرم پکوڑئیں کھاتا اور اس کے ہاتھوں کی چائے پی کر ہی جاتا۔ پاپا ممی بھائی جان (خیر بھائی جان کا تو وہ دوست ہی تھا سب اس کے عادی ہو گئے تھے۔ کسی شام وہ لیٹ ہو جاتا تو پاپا ممی کو پریشانی ہو جاتی۔)

پندرہ دن بعد وہ چلا گیا تھا وہ کیا گیا لگا شام بالکل اداس ہی ہو گئی ہو۔ سب کو اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی ہر آہٹ پر اس کے آنے کا گمان ہوتا۔ نہیں چاہتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں اسے بھی اس کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

پندرہ دن بعد وہ چلا گیا تھا وہ کیا گیا لگا شام بالکل اداس ہی ہو گئی ہو۔ سب کو اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی ہر آہٹ پر اس کے آنے کا گمان ہوتا۔ نہیں چاہتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں اسے بھی اس کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔

چار ماہ بعد اچانک وہ آ گیا تھا....

بھائی جان دہلی انٹرویو دینے گئے ہوئے تھے.... وہ پاپا سے بیٹھ کر سرحد کی باتیں کرتا.... ممی کے ہاتھوں کی پکوڑیاں فرمائش کر کے کھاتا۔ بھائی جان کو مس کرتا اور مجھ سے چائے طلب کرتا۔

دو دن بعد بھائی انٹرویو دے کر واپس آ گئے اور رات پاپا ممی اور بھائی جان نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیا کہا تھا۔ آیت اسد کے لیے تمھارا رشتہ آیا ہے۔ پاپا ممی اور مجھے یہ رشتہ دل سے پسند ہے اسد میں وہ ساری خوبیاں ہیں جو ایک اچھے لڑکے میں ہونی چاہیے اس کے گھر والے بھی بہت اچھے ہیں یہ تم جانتی ہی ہو پھر بھی تمھیں اس رشتے سے کوئی اعتراض ہو تو بتا دینا.... وہ گم سم بھائی جان کا منھ دیکھ رہی تھی بھائی جان آپ لوگوں کی پسند ہی میری پسند ہے وہ یہ کہتے ہوئے شرما کر بھاگ گئی۔

پھر کافی شاندار طریقے سے انگیجمنٹ ہوئی تھی۔ اسد نے اسے اور اس نے اسد کو رنگ پہنائی تھی اور سب کی مبارک باد وصول کی تھی۔ یہ رنگ صرف انگیجمنٹ کی نہیں ہے بلکہ میرے پیار کی نشانی ہے کیونکہ میں نے جب آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تو اس دن آپ پر اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ وہ سر جھکائے صرف مسکراتی رہی۔

وہ ایک ہفتہ بعد واپس چلا گیا تھا چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ طے پائی۔ اس کا کام آیت کے پاس آتا رہتا تھا۔ بھائی جان کو بھی دلی میں جاب مل گئی۔ پاپا کو آفس سے فرصت نہیں تھی۔ اس لیے ممی کے ساتھ اسے ہی شاپنگ کے لیے جانا پڑتا تھا رشتہ دار تو وقت پر آتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے شادی کا دن آ پہنچا.... بھائی جان چھٹی لے کر ایک ہفتہ قبل ہی آ گئے تھے پھر پاپا اور بھائی جان نے مل کر شادی کی پوری تیاری کر ڈالی۔ مایوں، مہندی کی رسمیں گھر پر ہی ہوئی تھیں۔ شادی میرج ہال سے ہونی تھی ہال کو کافی شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا۔ شہنائی کی میٹھی دھن کانوں میں رس گھول رہی تھی!

نکاح اور کھانے کے بعد کچھ رسموں کے ساتھ رونمائی کی رسمیں بھی ہوئیں تھیں۔ رونمائی میں اسد نے ایک خوبصورت سا لاکٹ اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا جس پر دونوں کا نام کندہ تھا اور اس کی ضد پر رات ہی رخصتی ہو گئی تھی۔

پھر وہ سارے ارمان سجائے حجلۂ عروسی میں آیا تھا۔ اس نے اس کا گھونگھٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ ہیڈ کوارٹر سے کال آ رہی تھی اچانک دشمن ملک نے حملہ کر دیا وہ ایمرجنسی پہنچے (ٹریننگ کے دوران یہ ہدایت دی جاتی ہے)

اور شب عروسی پر ہی اسد کو آیت کو چھوڑ کر جانا پڑا کیونکہ وہ اپنے فرض سے منہ نہیں موڑ سکتا تھا۔

جاتے ہوئے اس نے آیت کو گلے سے لگایا تھا اور اس کے آنسوؤں کو پوچھتے ہوئے کہا تھا میں واپس آؤں گا میرا انتظار کرنا اللہ حافظ اور آیت اشکبار آنکھوں سے بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہ گئی تھی۔

شادی کا گھر اداسی میں تبدیل ہو گیا تھا۔سب اشکبار آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے اس نے پاپا اور ماما کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔آپ لوگ آیت کا پورا خیال رکھیں گے۔

اسے خود کو سنبھالنے میں کافی وقت لگ گیا تھا۔ Network مل جانے پر اسد کی کال آجاتی تھی۔اسد کے پاپا ماما مہوش اور انس کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔وہ کبھی کبھی اپنی ممی کے پاس بھی چلی جایا کرتی۔

چار ماہ گزر چکے تھے۔جنگ تھم گئی تھی فوجی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔اسد نے بھی چھٹی کی عرضی دے دی تھی اور آیت کو صرف اتنا بتایا تھا کہ اگر چھٹی کی عرضی منظور کر لی گئی تو وہ جلد ہی آجائے گا۔

اس کی چھٹی کی عرضی منظور کر لی گئی تھی۔شری نگر سے دلی کی فلائٹ کی ٹکٹ اور دلی سے پٹنہ کی ٹکٹ بک کروانے کے بعد اس نے گھر اطلاع دی تھی....اچانک سے کسی شور کی آواز سے وہ جیسے خواب سے چونک پڑی تھی۔

نیچے سے بہت سارے لوگوں کے بولنے اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آرہی تھی اور وہ بھی جانے کہاں کھو گئی تھی لگتا ہے سارے رشتہ دار اسد کے استقبال کے لیے آنے شروع ہو گئے....بھائی جان نے بھی کہا تھا وہ بھی فلائٹ پکڑ کر آجائیں گے پاپا ممی بھی آگئے ہوں گے مجھے بھی اس کے استقبال کے لیے نیچے جانا چاہیے۔

پھر خود کو دلہن کی شکل میں دیکھ کر اس نے نیچے جان کا ارادہ ترک کر دیا.... یہیں بیٹھ کر میں اسد کا انتظار کرتی ہوں۔

وہ اسد کی فوٹو فریم اپنے سینے سے لگائے اس سے سرگوشی کرتی رہی ایک ایک لمحہ کٹتے نہیں کٹ رہا تھا۔ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا اسد کو آنے میں کچھ سوچ کر اس نے ٹی وی آن کر دیا۔نیوز چینل لگا ہوا تھا اور خبریں چل رہی تھیں بڑے بڑے حرفوں میں Breaking News آرہا تھا۔

کشمیر کے سرحد پر اچانک سے آدھی رات کو دشمنوں نے پھر سے حملہ بول دیا ہے۔جس میں درجنوں کی تعداد میں فوجی شہید ہو گئے۔فوجیوں کی لسٹ میں مارے گئے فوجیوں کے ناموں کے ساتھ ایک ایک فوٹو اور ان کے تفصیل بتائی جا رہی تھی جس میں اسد درانی کا نام بھی شامل تھا۔

اس کی تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی تھی اور کمرے میں فرش پر شیشے کی کرچیاں بکھر گئیں۔وہ آنکھیں پھاڑے نیوز کی تفصیل کے ساتھ ساتھ اسد کی فوٹو دیکھ رہی تھی اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

پھر اس کی وحشت ناک چیخ سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ بے تحاشہ سیڑھی سے نیچے کی طرف دوڑی تھی اس کا پاؤں لہنگا میں الجھا تھا اور وہ خود کو روک نہیں پائی اور سیڑھی سے گرتی گئی وہ بیہوش ہو چکی تھی۔

گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔سر سے اور ناک سے خون کے فوارے آرہے تھے۔عدل نے جلدی سے اسے گود میں اٹھایا تھا اور گاڑی کی طرف بھاگے تھے اور پیچھے بہت سارے لوگ تھے۔

ہاسپٹل میں ڈاکٹروں کی پوری ٹیم پہنچ گئی Formality کے بعد اسے .I.C.U میں رکھا گیا تھا۔

کیونکہ دماغ میں کافی چوٹ آجانے کی وجہ سے اس کی حالت کافی سیریس تھی (ڈاکٹر کے مطابق ساری رپورٹ آنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے

شام ہوتے ہوتے اس کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی....

انتھک کوششوں کے باوجود بھی ڈاکٹر اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور اس کی روح اپنے محبوب سے جا ملی تھی.... ؟

دوسرے دن فوجی اسد کی باڈی لے کر آئے تھے....خوشی کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ایک کہرام برپا تھا۔

لوگوں کی بھیڑ امڈ آئی تھی۔

پھر دونوں جنازوں کو آخری رسم کے لیے تیار کیا گیا....

قومی جھنڈے سے ڈھکا اسد کا تابوت جا رہا تھا۔پیچھے پیچھے اس کا تابوت اور نم آنکھوں سے لوگ اس مثالی جوڑے کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

جب اسد کو قومی اعزاز اور سلامی سے نوازا گیا تو اس کی روح کو ایسا محسوس ہوا ہو گا جیسے اس کے شوہر کے ساتھ اسے بھی اس اعزاز سے نوازا گیا۔

□□□

Nuzhat Nabila
Ahmad Villa
Masjid Road
Purab Sarai
Munger-811201(Bihar)
Mob: 8540049426

لذیذ پکوان

دہی وڑا چاٹ

دہی وڑا چاٹ کے اجزااور آلو وڑا چاٹ کے اجزا

ابلے ہوئے آلو 6 عدد، کارن فلور-4 کھانے کے چمچ، نمک آدھا چمچ، لال مرچ-آدھا چائے کا چمچ، چاٹ مسالہ-آدھا چائے کا چمچ، گھی-2 چمچ، دہی-2 کپ، کالا نمک حسب ذائقہ، چینی پاؤڈر-2 چمچ، زیرہ پاؤڈر، میٹھی چٹنی، ہری چٹنی

آلو کو فرائی کرنے کا عمل

ابلے ہوئے آلو چھیل کر پلیٹ میں رکھیں۔ پھر ایک پیالے میں 4 کھانے کے چمچ کارن فلور اور 2 کھانے کے چمچ پانی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ جب یہ گل جائے تو اس میں نمک، ایک عدد سرخ مرچ اور چاٹ مسالہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔

اب پین میں 2 چمچ گھی ڈال کر آنچ پر گرم کریں۔ ایک ابلا ہوا آلو لیں اور اسے ہتھیلی پر دبائیں اور وڑا کی شکل دیں۔ پھر کارن فلور کے بیٹر کو ایک بار ہلاتے ہوئے آلو کو بیٹر میں ڈبو کر کوٹ کر لیں۔

گرم گھی میں ڈبوئے ہوئے آلوؤں کو ڈالیں اور باقی کو بھی اسی طرح دبائیں، بیٹر میں کوٹ کر پلیٹ میں رکھیں۔ آنچ کو درمیانے درجے پر دھیمی کریں اور انھیں دونوں طرف سے سنہری بھوری ہونے تک بھونیں۔ باقی کو بھی اسی طرح بھون کر تیار کریں۔

آلو چاٹ بنانے کا عمل

ایک پیالے میں 2 کپ دہی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ پھر اس میں کالا نمک اور 2 عدد پاؤڈر چینی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ اب ایک پلیٹ میں دو تلے ہوئے آلو ڈال کر اس پر دہی ڈال دیں۔ پھر ان پر کچھ بھنا ہوا زیرہ پاؤڈر، کالا نمک، چاٹ مسالہ اور لال مرچ ڈال دیں۔

پھر اس پر کچھ ہری چٹنی، میٹھی چٹنی اور کچھ سیو ڈال دیں۔ اس طرح آلو کی چاٹ تیار ہو جائے گی۔ اسی طرح باقی پلیٹیں تیار کریں۔

سرخ اور ہری مرچوں کا اچار

مکسڈ اچار کے لیے اجزا

ہری اور سرخ مرچ-300 گرام، نمک-1 چمچ، ادرک-(60 گرام)، سونف-2 چمچ، میتھی 1 چمچ، اجوائن-1 چمچ، سیاہ سرسوں کے بیج-2 کھانے کے چمچ، ہلدی پاؤڈر-1 چمچ، کشمیری لال مرچ-1 چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، کلونجی ایک چائے کا چمچ، سرسوں کا تیل-(4 کھانے کے چمچ)، لیموں کا رس-1 چمچ، سفید سرکہ-1 چمچ

سرخ اور ہری موٹی مرچوں کو اچھی طرح دھو کر دھوپ میں خشک کرلیں۔ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ایک بڑے پیالے میں رکھیں۔اب تمام مرچوں پر 1 چمچ نمک چھڑک کر ڈھک کر 1 گھنٹہ دھوپ میں رکھ دیں۔جب وقت ہو جائے تو مرچوں سے پانی الگ ہو جائے گا، انھیں چھلنی میں ڈال کر ان میں سے سارا پانی نکال لیں۔انھیں کچھ دیر چھلنی میں چھوڑ دیں۔دریں اثنا، ادرک کے 3 ٹکڑوں (60 گرام) کو چھیل کر اچھی طرح دھولیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔

اب پین کو ہلکا گرم کریں اور اس میں 2 کھانے کے چمچ سونف، 1 چمچ میتھی کے دانے اور 1 چمچ اجوائن ڈالیں۔1 منٹ تک فرائی کرنے کے بعد اس میں 2 کھانے کے چمچ کالی سرسوں ڈال کر 10 سے 15 سیکنڈ تک بھونیں اور آنچ بند کر دیں۔پین میں مصالحے کو کچھ دیر ہلانے کے بعد پلیٹ میں نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔جب یہ مکمل طور پر ٹھنڈا ہو جائے تو انھیں مکسر جار میں ڈال کر موٹا موٹا پیس لیں۔

اب ایک پین میں سرسوں کا تیل گرم کریں یہاں تک کہ دھواں اٹھ جائے۔پھر آنچ بند کر کے تیل کو ٹھنڈا کرلیں۔جب یہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں ہلدی، کلونجی اور ہینگ ڈالیں۔انھیں مکس کریں اور ہلکے گرم تیل میں فرائی کریں۔

ایک پیالے میں مرچ، کٹی ہوئی ادرک، نمک، موٹا پسا ہوا مصالحہ، 1 عدد کشمیری لال مرچ پاؤڈر اور تیل ملا کر مصالحے کے ساتھ ڈالیں۔انھیں اچھی طرح مکس کریں، 1 کھانے کا چمچ لیموں کا رس اور 1 کھانے کا چمچ سفید سرکہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔

اچار کو ایک پیالے میں 3 دن تک ڈھک کر رکھیں۔3 دن کے بعد اچار تیار ہو جائے گا، اسے کسی بھی شیشے کے برتن میں محفوظ کریں اور اس کے ذائقے سے لطف اندوز ہوں۔

راجما پنیر کٹلیٹ

راجما گلوٹی کباب کے اجزا، سفید پھلیاں-(100 گرام)، سرخ پھلیاں (100 گرام)، آلو (200 گرام) (ابلے ہوئے)، تیل 2 سے 3 چمچ، ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا (پسا ہوا)، ہری مرچ - 2 (باریک کٹی ہوئی)، چاٹ مسالہ - 1 چمچ، دھنیا پاؤڈر - 1 چمچ، زیرہ پاؤڈر-1 چمچ، لال مرچ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، گرم مسالہ ایک چائے کا چمچ، نمک-1 چمچ

ترکیب-راجما گلوٹی کباب بنانے کا طریقہ

راجما کو اچھی طرح دھو کر صاف پانی میں 8 سے 10 گھنٹے تک بھگو دیں۔ککر میں بھیگی ہوئی پھلیاں ڈالیں، دو کپ پانی اور تھوڑا نمک ڈال کر مکس کریں، ککر بند کر کے 1 سیٹی آنے تک پکائیں۔جب ککر کی سیٹی بج جائے تو گیس کم کر دیں اور ہلکی آنچ پر 3 منٹ تک پکنے دیں۔3 منٹ کے بعد گیس بند کر دیں اور ککر کا پریشر ختم ہونے کے بعد ککر کو کھولیں اور راجما کو چھلنی سے چھان لیں تاکہ پانی الگ ہو جائے۔راجما کو ٹھنڈا ہونے دیں۔

ایک پیالے میں ابلے ہوئے آلو کو لیں۔راجما ٹھنڈا ہونے کے بعد انھیں مکسر جار میں ڈال کر ہلکا پیس لیں۔آلو پر مشتمل ایک پیالے میں پسی ہوئی راجمے کی پھلیاں نکال لیں۔ہرا دھنیا، ادرک، ہری مرچ، دھنیا پاؤڈر، چاٹ مسالہ، بھنا ہوا زیرہ، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالہ، نمک ڈال کر مکس کریں۔کٹلٹس بنانے کا مکسچر تیار ہے۔

راجما کٹلیٹس

کٹلٹس بنانے کے لیے تھوڑا سا مکسچر نکال کر ہاتھوں سے دبا کر گول کرلیں۔پھر اسے چپٹا کر کے کٹلیٹ کی شکل دیں۔تمام کٹلٹس کو اسی طرح تیار کریں۔

کٹلٹس کو فرائی کرنے کے لیے ایک پین میں 2 کھانے کے چمچ تیل ڈال کر گرم کریں۔کٹلٹس کو ایک ایک کر کے گرم تیل میں ڈالیں اور کٹلٹس کو ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔جب کٹلٹس نیچے سے گولڈن براؤن ہو جائیں تو انھیں الٹ دیں اور اس وقت تک بھونیں جب تک کہ وہ دوسری طرف سے بھی سنہری بھوری نہ ہو جائیں۔جب دونوں طرف سے گولڈن براؤن ہو جائے تو کٹلٹس کو پلیٹ میں نکال لیں۔

کرسپی اور مزیدار راجما کٹلٹس تیار ہیں۔ان کٹلٹس کو ہرے دھنیے کی چٹنی یا ٹماٹر کی چٹنی یا اپنی پسند کی کسی بھی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

(بحوالہ: www.nishamadhulika.com)

مشکور احمد

جسم انسانی اور ضرورت غذا

صحت کا دارومدار اچھے اور صحتمند خون پر ہے جو صرف عمدہ غذا سے حاصل ہوتا ہے، مشہور زمانہ طبیب ربن طبری اس ضمن میں کہتا ہے کہ ''جب غذا بدن میں داخل ہوتی ہے تو سب سے پہلے خون میں اضافہ کرتی ہے، اس کے بعد گوشت میں اور پھر یہی غذا تمام اعضا میں افزائش کا باعث بنتی ہے اور اسی افزائش جسم کا نام نشوونما ہے۔ نیز ہر زندہ چیز غذا کی محتاج ہے تا کہ سورج کی روشنی اور ہوا کی وجہ سے اس کے بدن کا جو حصہ تحلیل ہو جائے اس کا بدل ما یتحلل حاصل ہو سکے۔''

انسان کی زندگی میں قوت و صحت کا دارو مدار ہوا اور ماکول و مشروب پر ہے اور پھر ان میں غذا کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ انسان اس کے بغیر روز بروز گھلتا جاتا ہے اور صحت میں ذبولی کیفیت لاحق ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں بتدریج کمزور ہو کر صحت گنوا بیٹھتا ہے اس لیے غذا کی ضرورت مجملہ جسمِ انسانی اور انفرادی طور پر تمام اعضا کی نشوونما میں یکساں طور پر پڑتی ہے۔

جسم کی نشوونما کے لیے غذا کا عضو کے صرف کسی ایک جزو تک پہنچ جانا ہی کافی ہے اس سے اس پورے عضو کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اور غذا ایک عضو کے بعد دوسرے عضو میں افزائش کا سبب بنتی ہے یہاں تک کہ وہ تمام جسم تک پہنچ جاتی ہے۔

مختلف جسمانی حرکات وافعال کے سبب زندگی میں ہر روز بلکہ ہر لمحہ ہمارا جسم تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً جس وقت ہم کوئی کام کرتے ہیں یا چلتے پھرتے ہیں، بولتے یا سانس لیتے یا سوچتے ہیں تو اس میں ہمارے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ خرچ ہو کر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ جس کو ہم بطور فُضلہ (پسینہ اور بول و براز وغیرہ) جسم سے خارج کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جسم کا جو حصہ صَرف ہوتا ہے اس کے بدل کے طور پر خوراک کی ضرورت پڑتی ہے اور جس سے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ گویا کہ مندرجہ ذیل دو ضرورتوں کے تحت ہم غذا استعمال کرتے ہیں۔

الف): ایک تو یہ کہ ہمارا جسم جو ہر وقت تحلیل ہوتا رہتا ہے اس کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔

(ب): دوسرے یہ کہ اس میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ گرم رہتا ہے۔ چنانچہ اگر جسم کو کافی غذا نہ پہنچے تو وہ لاغر اور کمزور ہو جاتا ہے، اس میں کام کاج کرنے کی طاقت نہیں رہتی، پھر کمزوری کے سبب مختلف قسم کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا آرا کی روشنی میں عمدہ غذائیت کو درج ذیل امور کے لیے ضروری سمجھنا چاہیے۔

ا۔ اچھی غذائیت سے صالح اخلاط خصوصاً دمِ صالح پیدا ہوتا ہے۔

ii۔

iii۔غذا تحلیل شدہ اجزا کا بدلِ ما یتحلل مہیا کرتی ہے۔

iv۔غذائیت سے رطوبتِ غریزی قائم رہتی ہے۔

v۔غذائیت حرارتِ غریزی کے لیے ایندھن کا کام کرتی ہے جس سے جسمانی توانائی وقوت پیدا ہوتی ہے۔

متوازن غذا (Balanced Diet)

دنیا کے ہر گوشے میں غذائی مواد اور ان کا طریقۂ استعمال ماحول، خطہ، معاشی حالت، قبولیت، مذہب وملت، رسم ورواج، عادت واطوار کی بنا پر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کے باوجود جسمانی ساخت، قدو قامت اور نوعیت عمل کے لحاظ سے ایک خاص مقدار میں توانائی کا حصول لازم ہوتا ہے جو کہ مختلف موادِ غذائی سے حاصل ہوتی ہے۔اس خاص مقدار کو ہم متوازن غذا بھی کہہ سکتے ہیں۔

''متوازن خوراک وہ ہے جس کے اندر غذا کے مختلف اجزا ایسے متناسب انداز میں موجود ہوں جو کہ جسم کی ضرورتِ توانائی کو پورا کرسکیں جس سے حوامض لحمیہ، حیاتین، معدنیات، شحمیات، نشاستہ جات اور دیگر اجزائے مغذّ یہ کافی مقدار میں حاصل ہوسکیں جس سے صحت، نشاط اور عمومی تندرستی قائم وبرقرار رہ سکے، نیز لاغری کی حالت کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کا کچھ ذخیرہ بھی محفوظ رہ سکے۔''

متوازن خوراک کے سلسلے میں درج ذیل چند باتیں ذہن نشین کرنی ضروری ہیں۔

الف): سب سے پہلی اور اہم ترین چیز یہ ہے کہ لحمین کی یومیہ ضرورت حاصل ہوتی ہے۔

(ب): دوسرے نمبر پر شحم آتا ہے جو صرف اس قدر ہو کہ اس کے ذریعہ 20-30 فیصدی یومیہ توانائی کی حصولیابی ممکن ہوسکے۔

(ج): نشاستہ سے پُر قدرتی لیفی اشیا کے ذریعہ بقیہ توانائی حاصل کی جائے۔

(د): علاوہ ازیں حیاتین ومعدنیات کی ضروری مقدار بھی حاصل ہوتی رہے۔

ماہرین کے اقوال کی روشنی میں متوازن خوراک سے مراد وہ خوراک ہے جو اپنی کیفیت اور مقدار کے لحاظ سے جسم کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہو جس سے نمو، صحت کی برقراری اور تولید کے افعال انجام پاسکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ غذائی مقدار جسم کی توانائی کی ضرورت کو پورا کرتی ہو اور اگر نمو یا مرض کے بعد کی کمزوری ہو تو اس کو دور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، نیز کیفیت کے اعتبار سے وہ تمام غذائی اجزا اس میں شامل ہوں جو جسم کے طبعی افعال کی انجام دہی کے لیے ضروری ہوتے ہیں مثلاً ضروری حوامض لحمیہ، ضروری حوامض شحمیہ، حیاتین کی ضروری مقدار، معدنیات اور پانی۔

استحالۂ قاعدی کے لیے ضروری توانائی

استحالۂ قاعدی کے لیے ایک معیاری آدمی کو 40 حرارے فی مکعب میٹر سطحی رقبۂ جسم فی گھنٹہ کے حساب سے درکار ہوتی ہے اور چونکہ اوسطاً جسم کا رقبہ 1.80 مکعب میٹر ہوتا ہے اس لیے 1.80x40=72

حرارے فی گھنٹہ توانائی درکار ہوتی ہے اس طرح 24 گھنٹے میں ایک بالغ مرد کو 1728=72x24 حرارے توانائی کی ضرورت ہوگی۔

عضلاتی و ذہنی حرکات کے لیے مطلوبہ توانائی

چونکہ مختلف افراد الگ الگ قسم کی مصروفیت رکھتے ہیں اس لیے ان کی توانائی کی ضرورت بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔

دماغی کام کرنے والے لوگ جو جسمانی محنت نہیں کرتے ان میں کام کرنے کے دوران استحالہٗ قاعدی کا 25-20 فیصد (400 حرارے) اضافہ ہوتا اور ہلکا پھلکا کام کرنے کے دوران 40-30 فیصد کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح متوسط کام کرنے والوں میں استحالہٗ قاعدی کا 60-50 فیصد اضافہ ہوجاتا ہے اور شدید جسمانی کام کرنے والوں میں 100 فیصد اضافہ ہوتا ہے۔ کام کی نوعیت کے اعتبار سے یہ اضافہ استحالہٗ قاعدی کے لیے مطلوبہ توانائی میں شامل کرلیا جاتا ہے اور 24 گھنٹے میں سے جتنی دیر آدمی مصروف رہتا ہے اس مدت کے لیے توانائی کی ضرورت اس میں سے محسوب کرلی جاتی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کوئی بھی غذا مکمل طور پر ہضم ہونے کے بعد اس میں موجود پوری توانائی خارج نہیں کرتی بلکہ دورانِ ہضم و انجذاب اس میں کچھ نہ کچھ ضیاع ہوتا ہے اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے 10 فیصد حراروں کا اضافہ کرلیا جاتا ہے۔ نیز کھانا پکانے اور تیار کرنے میں کچھ حرارے ضائع ہوجاتے ہیں اس کمی کی تکمیل کے لیے بھی بعض ماہرین نے 100 حرارے کے الگ سے اضافہ کی سفارش کی ہے۔ اس طرح ایک بالغ صحتمند معیاری آدمی کی ضرورتِ توانائی 2320 حراروں سے لے کر 3490 حرارے تک بتائی جاتی ہے۔ ایک معیاری مرد، عورت اور بچوں کی مختلف عمروں میں ان کی روزمرہ کی ضرورت توانائی کا اندازہ ICMR کی سفارش کردہ چارٹ کی مدد سے کیا جاسکتا ہے جو درج ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

جدول برائے یومیہ ضرورت توانائی

گروہ	کام کی نوعیت/عمر	وزن جسم	توانائی Kcal/d
مرد	قلیل فعل (Sedentary work)	60 کلوگرام	2320
مرد	معتدل فعل (Moderate work)	60 کلوگرام	2730
مرد	کثیر فعل (Heavy work)	60 کلوگرام	3490
عورت	قلیل فعل (Sedentary work)	55 کلوگرام	1900
عورت	معتدل فعل (Moderate work)	55 کلوگرام	2230
عورت	کثیر فعل (Heavy work)	55 کلوگرام	2850
عورت	حاملہ	55 کلوگرام	+350

عورت	مرضعہ 6-0ماہ	55 کلوگرام	+600
عورت	مرضعہ 12-6ماہ	55 کلوگرام	+520
نوزائیدہ	6-0ماہ	5.4 کلوگرام	92فی کلوگرام
نوزائیدہ	12-6ماہ	8.4 کلوگرام	80فی کلوگرام
طفل	3-1سال	12.9 کلوگرام	1060
طفل	3-1سال	18.0 کلوگرام	1350
طفل	3-1سال	25.1 کلوگرام	1690
لڑکا	3-1سال	34.3 کلوگرام	2190
لڑکی	3-1سال	35.0 کلوگرام	2010
لڑکا	3-1سال	47.6 کلوگرام	2750
لڑکی	3-1سال	46.6 کلوگرام	2330
لڑکا	3-1سال	55.4 کلوگرام	3020
لڑکی	3-1سال	52.1 کلوگرام	2440

شیر خوار، بڑھتے ہوئے بچے، حاملہ نیز مرضعہ میں کچھ اضافی مقدار پیش نظر رکھی جاتی ہے جب کہ عام خواتین کے لیے 10 فیصد حراروں میں کمی کردی جاتی ہے۔ اس طرح سے حراروں کی جوضرورت سامنے آتی ہے اس کو مختلف غذائی اجزا میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حراروں کی اس مقدار کو غذائی جنس میں تبدیل کرنے کے لیے لحمی اور نشاستی غذائی اجزا کے ہر 1 گرام سے 4 حرارے اور شحمی اجزا کے ہر 1 گرام سے 9 حرارے کا حساب رکھا جاتا ہے۔ حراروں کی مذکورہ مقدار کے حصول کے لیے مختلف غذائی اجزا کے اختیار کرنے میں اجزائے لحمیہ کو اولیت دی جائے کیونکہ انسجہ کی ٹوٹ پھوٹ کا بدل اجزائے لحمیہ سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ اجزائے لحمیہ میں مقدار کے ساتھ ان کے معیار کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ناگزیر حوامضِ لحمیہ کے لیے اعلیٰ لحمین کی خوراک میں شمولیت ضروری ہے چنانچہ لحمین کی ضرورت کا نصف حصہ اعلیٰ قسم کی لحمین یعنی حیوانی لحمین سے حاصل ہونا چاہیے۔ بالغوں میں 1 گرام لحمین یومیہ فی کلوگرام جسمانی وزن کے حساب سے دیا جانا چاہیے۔ بچوں، حاملہ و مرضعہ میں یہ مقدار 4-3 گرام یومیہ فی کلوگرام جسمانی وزن ہوسکتی ہے۔

اس طرح ایک متوازن قسم کی خوراک میں توانائی کی ضرورت کا 15-10 فیصد حصہ لحمی اجزا سے، 30-20 فیصد شحمی اجزا سے اور بقیہ 70-60 فیصد نشاستی اجزا سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معدنیات کی ضرورت کا بھی خاطر خواہ لحاظ رکھنا ضروری ہے نیز حیاتین کی ضروری رسد بھی خوراک کے تعین میں ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ خوراک میں موسمی پھل و سبزیوں کی شمولیت سے حیاتین کی ضروری مقدار حاصل ہوجاتی ہے۔

(بحوالہ: حفظان صحت، قوم کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

حسن کی نگہداشت

جلد کی دیکھ بھال کے لیے اہم نکات

شہد کے ساتھ چہرے کا پیسٹ بنائیں

شہد ایک قدرتی موئسچرائزر ہونے کے ساتھ ساتھ جلد کے لیے قدرتی جلد کا ایکسفولیٹر بھی ہے۔شہد کا پیسٹ چہرے پر لگانے سے جلد کو غذائیت ملتی ہے۔اس کے ساتھ خشک جلد کے مسئلے سے بھی آرام ملتا ہے۔ آپ کی جلد کی قسم کے مطابق پانی میں شہد، کچا دودھ اور لیموں کا رس ملا کر

جلد پر لگا سکتے ہیں۔

جلد کی پرورش کے ساتھ ساتھ اسے صحت مند رکھنے کے لیے روزانہ جلد کی صفائی، سکن ٹوننگ اور موئسچرائزر لگانے کے اصول پر عمل کریں۔ یہ نہ صرف جلد کو سورج کے نقصان اور ریڈیکل نقصان سے بچاتا ہے بلکہ یہ جلد کو نرم اور جوان بھی رکھتا ہے۔

بھرپور نیند لینا نہ بھولیں

ہر رات کافی نیند لینا نہ صرف جسم اور دماغ بلکہ آپ کی جلد کے لیے بھی بہت ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دراصل، اچھی طرح سے سونے سے جلد کو ٹھیک ہونے میں مدد ملتی ہے اور جلد کی کولیجن بننے کا عمل بھی بہتر طریقے سے ہوتا ہے۔

میک اپ سے وقفہ لیں

بھاری میک اپ کی وجہ سے جلد کو پہنچنے والے نقصان کو ٹھیک کرنے کا ایک اچھا طریقہ میک اپ سے مختصر وقفہ لینا ہے۔ چند دنوں تک اپنے چہرے پر میک اپ یا بیوٹی پراڈکٹس کا استعمال نہ کریں۔اس سے جلد کو سکون

ملے گا اور جلد کے مسام بھی اچھی طرح کھل سکیں گے۔ اس کے ساتھ جلد پر دانے اور دھبے جیسے مسائل سے بھی نجات ملتی ہے۔

اگر آپ اکثر بیمار ہوتے ہیں تو کیا کریں

صحت منداور فٹ رہنا اچھی زندگی کی کلید ہے۔ لیکن اکثر ہم بار بار بیمار پڑتے ہیں، خاص کر جب موسم بدلتا ہے۔ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ کچھ ایسے اقدامات ہیں، جن کے ذریعے آپ بار بار بیمار ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اچھا طرز زندگی آپ کو بار بار بیمار ہونے سے بچا سکتا ہے۔ آیئے جانتے ہیں طرز زندگی کی ان پانچ عادات کے بارے میں جنھیں آپ اپنے روزمرہ کے معمولات میں شامل کر کے بار بار بیمار ہونے کے مسئلے سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

دن میں کم از کم 3 بار متوازن غذا لیں متوازن غذا سے مراد وہ غذائیں ہیں جن کے استعمال سے آپ کو تمام ضروری غذائی اجزا حاصل ہوتے ہیں۔ بار بار بیمار ہونے سے بچنے کے لیے ہر ایک کو کم از کم تین بار متوازن خوراک لینا چاہیے۔ اس میں موسمی پھل اور سبزیاں، نیز گری دار میوے، بیج اور کچھ دودھ کی مصنوعات شامل ہیں۔ صبح کے صحت بخش ناشتے کے بعد دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے تک کی خوراک صحت بخش ہونی چاہیے۔

روزانہ آدھا گھنٹہ پیدل چلیں

چہل قدمی ایک بہترین ورزش ہے جس میں جسم کے تمام پٹھے حرکت کرتے ہیں۔ چہل قدمی کولیسٹرول اور بلڈ پریشر کو کنٹرول میں رکھتی ہے جس سے دل کی بیماری کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دماغ کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور تناؤ دور ہوتا ہے۔ جب آپ روزانہ صبح سویرے آدھا گھنٹہ چہل قدمی کریں گے تو آپ خود کو بہتر محسوس کریں گے۔

اپنے آپ کو ہائیڈریٹ رکھیں

کچھ لوگ پانی پینے میں کافی سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ پانی ہمارے جسم کی بیشتر سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پانی یا دیگر سیال جسم کے درجہ حرارت کو کنٹرول کرتا ہے۔ مشترکہ پھسلن کو برقرار رکھتا ہے اور جسم کے تمام حصوں کے مناسب افعال کو برقرار رکھتا ہے۔ اس لیے صبح سے رات تک آپ جسم میں پانی کی ضرورت پوری کرتے رہتے ہیں۔ سادہ پانی کے علاوہ آپ لیمونیڈ یا پانی سے بھرپور پھل کھا سکتے ہیں۔

ذہنی صحت کو سمجھیں

اکثر لوگ دماغ میں ہونے والی ہلچل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ نہ وہ اپنا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی ان سے وابستہ لوگ اس طرف توجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں، یہ ان کے پورے طرز زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ نتیجتاً انسان کا طرز زندگی آہستہ آہستہ بگڑتا جاتا ہے۔ انسان ذہنی تناؤ اور ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا ہے جس کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوت مدافعت بھی کمزور ہونے لگتی ہے۔

نیند بھی اہم ہے

رات کا کھانا ہمیشہ سونے سے 3 گھنٹے پہلے کھائیں اور موبائل فون یا کسی دوسرے گیجٹ سے دور رہیں، تا کہ آپ صحیح وقت پر سو سکیں۔ مناسب وقت پر سونے اور جاگنے کے ساتھ بھرپور نیند لینے سے آپ کی قوت مدافعت بڑھتی ہے اور بار بار بیمار نہیں ہوتے۔

(بحوالہ www.thehealthsite.com)

تاثرات: نگر نگر سے

قومی اردو کونسل اپنے قیام سے ہی کافی فعال اور متحرک رہی ہے۔ بہت سی اسکیمیں کونسل کی زیر نگرانی چلتی ہیں۔ قومی اردو کونسل سے چار رسالے نکلتے ہیں جن میں اردو دنیا، بچوں کی دنیا، خواتین دنیا اور فکر و تحقیق شامل ہیں۔ یہ چاروں رسالے اپنی معنویت رکھتے ہیں۔ خواتین دنیا کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خواتین سے متعلق بہت سے مضمون، غزلیں، نظمیں اور خواتین سے تعلق رکھنے والے کچھ اہم گوشے رسالے میں موجود ہیں۔ منتخب اشعار اور خواتین سے تعلق رکھنے والے بہت سے موضوعات پر اس رسالے میں مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اپنے موضوع، اسالیب، مواد اور ڈیزائننگ کے اعتبار سے 'خواتین دنیا' ایک مکمل رسالہ ہے۔ اس میں بہت سے اچھوتے موضوعات پر مضامین کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔

اکتوبر 2022 کا شمارہ میری نظر سے گزارا۔ اداریہ میں مہاتما گاندھی اور ان کے وژن کے بارے میں کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی ہمارے لیے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کو اپنا کر ہم اپنی زندگی کو اور بہتر بنا سکتے ہیں۔ انھوں نے کثیر لسانی ثقافت کو فروغ دیا۔ انھوں نے اپنے اصولوں پر چل کر ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادیٔ وطن کے لیے نئے جذبات پیدا کیے۔

اکتوبر کا شمارہ کافی معلوماتی ہے۔ اس میں خواتین کے تعلق سے بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ احمد صغیر کا مضمون 'شکیلہ اختر کے افسانوں میں دلت ڈسکورس' مواد کے لحاظ سے اہم اور معلوماتی ہے۔ احمد صغیر نے ان کے افسانوں میں دلت موضوعات کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ عشرت ناہید کا مضمون 'دور جدید کا صوفی شاعر انور جلال پوری' پڑھ کر تو طبیعت خوش ہوگئی۔ مصنفہ نے بہت محنت سے مضمون لکھا ہے۔ بھگود گیتا کے بہت سے تراجم کیے جا چکے ہیں۔ انور جلال پوری نے گیتا کے سات سو ایک شلوکوں کو اردو کے ستر سو اکسٹھ اشعار میں ترجمہ کیا ہے۔ تمام عالم کو شری کرشن نے جو پیغام دیا ہے وہ عمل اور صرف عمل کا ہے۔ انسان کی بھلائی اور اس کی فلاح ہی گیتا کا اصل گیان ہے۔

علاوہ ازیں جن مضامین نے مجھے متاثر کیا ان میں 'ڈراما خون کا دھبہ'، سید تقی عابدی کی دبیر شناسی، اردو ناول سمت و رفتار، سرسید اور تعلیم نسواں، اردو کی نمائندہ خواتین افسانہ نگار اور اردو کی خواتین صحافی ہی قابل مطالعہ اور لائق توجہ ہیں۔ ڈاکٹر جوہی بیگم اور سمی اقبال کی غزلیں اور نظمیں پسند آئیں۔ شہناز اقبال کا افسانہ 'کمال کے دو بول' پڑھ کر اچھا لگا۔

امید ہے کہ خواتین دنیا کا یہ سفر یوں ہی جاری رہے گا اور اس کی قدر و منزلت میں روز بہ روز اضافہ ہوگا۔

یاسمین بیگم، دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں معذور بچوں کا نظام تعلیم

مصنف: محمد حفظ الرحمن، مترجم: فیض اللہ خان

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 148

قیمت: 90 روپے

انتخاب غزلیات میر

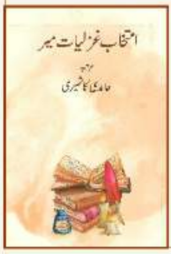

مرتب: حامدی کاشمیری

چوتھی اشاعت: 2022

صفحات: 208

قیمت: 115 روپے

پریم چند کی کہانیاں

مرتب: جوگندر پال

چوتھی اشاعت: 2022

صفحات: 235

قیمت: 125 روپے

سائنس کی کہانیاں

مصنف: انصار احمد معروفی قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 85

قیمت: 25 روپے

شعریات

ترجمہ وتعارف: شمس الرحمن فاروقی

پانچویں اشاعت: : 2022

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

تدریس جغرافیہ

مصنف: محمد ضیاء الدین علوی

تیسری طباعت: 2022

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

پھول بن

شاعر: ابن نشاطی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 190

قیمت: 115 روپے

نیاز فتح پوری کی تحریریں (ایک مختصر انتخاب)

مرتب: ف س اعجاز

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 166

قیمت: 100 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, नवम्बर-२०२२ वर्ष:६, अंक: ११

Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2022, Vol.6, Issue:11

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026

DL (S)-17/3555/2021-23

ISSN 2581-4826

Date of Publication: 13-11-2022

Date of Dispatch : 14 and 15 of every month

Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6